سنگت تراجم

Sangat Translation Series

لوہسون: منتخب افسانے

Selected Stories of Lu Xun

(Short Stories)

By: Lu Xun

Translation: Shah Mohammad Marri

لوہسون

منتخب افسانے

انگریزی سے ترجمہ:

شاہ محمد مری

سجّیں حقوق سنگت اکیڈمی ءِ نام محفوظ انت

Copyright @ Sangat Academy of Sciences

Selected Stories

Short Stories By Lu Xun

UrduTranslation By Shah Mohammad Marri

سنگت تراجم: 13

کتاب: منتخب افسانے

نوشتہ کار: لوہسون

رجانکار: شاہ محمد مری

چاپ: 2016ء

بہا: 200 کلدار

چاپ ءُ شنگ :

سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ

بہاءِ جاہ:

سنگت اکیڈمی

فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ۔

فون:+92-81-2843358

email: books@sangatacademy.net

Web: www.sangatacademy.net

فہرست

پیش لفظ 7

افسانے

پاگل کی ڈائری 14

کُنگ آئی چی 29

دوا 36

آنے والا کل 46

حادثہ 54

چائے کی پیالی میں طوفان 57

میرا پرانا گھر 68

ایک مسرور خاندان 81

صابن 90

طلاق 102

کتے کا خواب 114

تلوارسازی 116

آہ کیو کی سچی کہانی 138

پیش لفظ

لوہسون (قلمی نام) کو جائز طور پر جدید چین کا مفکر کہا جاتا ہے۔اس لئے کہ اس نے ساری روایتی جہتوں کو مسترد کیا اور خیالات سے لے کر فارم تک سب کچھ بدل ڈالا۔وہ کہانی کار، مضمون نگار، تنقید نگار اور ادبی نظریہ دان تھا۔لوہسون اس کا قلمی نام تھا۔

لوہسون 1898ء میں سترہ برس کی عمر میں حصولِ علم کی خاطر نانکنگ چلا گیا۔اور وہاں پر سرگرم عمل چینی انقلابیوں کیساتھ مل کر کام کرنے لگا۔جن کا مقصد فنگ بادشاہ کا تختہ اُلٹنا تھا۔لوہسون نے پہلے تو روایتی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ نیول اکیڈمی چلا گیا (99......1898)۔پھر سکول آف مائننگ اینڈ ریلوے (1899......1902) میں پڑھا۔بعد ازاں وہ 1902 میں میڈیکل کالج جاپان میں پڑھنے لگا۔اس نے 1906 میں طبی تعلیم کو خیر باد کہا اور ادب کے ذریعے انقلاب کے طریق کار کو اپنا لیا۔اس نے پرائیویٹ طور پر پڑھا بالخصوص ڈارون کو، جس کے نظریہ ارتقاء کو وہ بیالوجیکل سائنسز میں میٹریلزم کا مرکز گردانتا تھا۔وہ 1909 میں وہ واپس چین آ گیا۔

چین کا فیوڈل ازم دنیا کا سب سے قابلِ نفرت فیوڈل ازم تھا۔دیہات میں مقامی چھوٹے فیوڈل سے لے کر ملک کے سب سے بڑے فیوڈل یعنی بادشاہ تک ظلم واستبداد کا ایک منظّم جال موجود تھا۔اس فیوڈل ازم کو مذہبی اور نظریاتی پشت پناہی حاصل تھی۔بادشاہ فراعینِ مصر کی طرح ملک کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بھی تھا۔بادشاہ سلامت کو آسمانی حقوق حاصل تھے۔وہ زمین پر آسمان کا نمائندہ تھا اور خود کو ''تسی ان تسی (فرزندِ آسمان)'' کہلواتا تھا۔رعایا اس کے سامنے سربسجود

ہونا مذہبی فرض سمجھتی تھی۔اس سجدے کو ''کوٹو'' کہتے ہیں۔اور یہ بد بخت سجدہ صرف اور صرف چین میں مروج رہا ہے۔

پورے چین میں لازم تھا کہ لوگ اپنے سروں پر ہندو ملّاؤں کی طرح ایک چوٹی رکھیں۔چوٹی کا نہ ہونا بغاوت تصور ہوتا تھا۔جیسے مغرب زدگی، کفر، اور خدا سے بغاوت کی مذہبی لغت عطا کی گئی تھی۔دانشوروں نے ضرب المثل بنا رکھی تھی: آسمان میں دو سورج نہیں ہو سکتے اور زمین پر دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔

عورتوں کے بارے میں چین سے زیادہ وحشتناک فیوڈل ازم دنیا میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔عورتوں کے پیروں کو چھوٹا رکھنا گویا حسن کی علامت قرار دیا گیا۔یہ بد بخت لوگ پیدائش کے وقت سے ہی لڑکی کو لوہے کے جوتے پہنا دیتے تھے۔اس طرح پاؤں کی فطری نشو و نما روک دی جاتی تھی۔عورتیں عمر بھر پاؤں چھوٹے رکھنے کی اذیت جھیلتیں۔جب وہ جوان ہو جاتیں تو وہ ان کے ننھے منے پاؤں کو ''سنہری کنول'' اور ''معطر سوسن'' کہا جاتا تھا۔اس طرح بڑی عمر کی عورتوں کے پاؤں بھی شیر خوار بچے جیسے چند انچ کے چھوٹے پاؤں ہوتے تھے۔بڑے پاؤں والی عورت ''بچھل پا'' گردانی جاتی تھی۔اور اس سے بیاہ نہیں ہوسکتا تھا۔چینی عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کو اپنے پاؤں نہیں دکھاتی تھی اور انہیں چھپائے رکھنے میں وہی اہتمام کرتی جو دوسری اقوام کی عورتیں اپنی چھاتیاں چھپانے میں کرتی ہیں۔بد بخت فیوڈل معاشرے میں عورتوں کے ننھے منے پاؤں بے پناہ جنسی کشش کا سامان رکھتے تھے کیونکہ ان سے چلتے وقت بوجھل کولہوں میں نفس پرور تموج پیدا ہوتا تھا اور سُرین کا ابھار نمایاں ہو جاتا تھا۔

فیوڈل ازم تہہ در تہہ آمریت کا نام ہے۔جس میں سب سے زیادہ استبداد عورتوں پر ہوتا ہے۔چین میں فیوڈل ازم نے عورتوں پہ مردوں کی آمریت کو اس شکل میں ابدیت دے دی۔اس آمریت میں ایک بیمار جنسی نفسیات شامل تھی۔کہتے ہیں کہ سن 1368 تک عورتوں کے پاؤں چھوٹے رکھنے کی جنسی بھوک چین میں مقبول ترین بھوک بن چکی تھی۔اس بات پہ بھی فکر کیجئے کہ جن لوگوں نے اربوں کی تعداد میں بی بی حوا کی بیٹیوں کو اس توہین آمیز غلامی سے نجات دلا دی وہ

انسانیت کے کتنے بڑے محسن ہیں۔

بیویوں کے لیےمشہور کہاوت تھی: اگر تم ایک کتے سے شادی کرو تو کتے کی پیروی کرو، اگر تم ایک مرغے سے شادی کرو تو مرغے کی پیروی کرو۔

ان سب بکواسیات کو نظریاتی تحفظ کنفیوشس دیتا تھا۔ اس سے بڑا منحوس دانشور دنیا میں نہ ہوگا۔ اس کا ایک ہی فرمان ہمارے رونگھٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہے: ''عورتیں تین فرماں برداریاں کریں: اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو باپ کی فرمانبرداری کرے، شادی شدہ ہے تو خاوند کی، اور بیوہ ہے تو بڑے بیٹے کی''۔

اس بدترین فیوڈل ازم کے پس منظر میں جدید چینی ادب کی نمو ہوئی۔ اور اسی درندگی کے پس منظر میں اس نظام کے بدترین دشمن لوہسون کی ذہنی بالیدگی ہوئی۔

1910 میں وہ شاؤشِنگ مڈل سکول کا ٹیچر بنا۔ 1911ء کے انقلاب میں اس نے بھی انقلابی طاقتوں کا ساتھ دیا اور اس جمہوری انقلاب میں حصہ لیا جس نے قنگ سلطنت کو گرادیا۔

مگر 1911 کے انقلاب نے نہ مزدوروں کو کچھ دیا، اور نہ کسانوں کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ اس انقلاب نے کوئی بنیادی اصلاحات نہ کیں اور عورتوں کے توقعات کا ادراک نہ کیا۔ جو آئین بنا اس نے عورتوں کے حقِ رائے دہی سے انکار کر دیا۔

1917 میں روس میں انقلاب برپا ہوا جس نے بین الاقوامی سرمایہ داروں کو ہلا کر رکھ دیا اور پوری دنیا کے محکوموں کو امید بخشی۔ لوہسون بھی اس انقلاب سے زبردست طور پر متاثر ہوا۔

جنوری 1918ء میں لوہسون رسالہ ''نئی جوانی'' کے شعبہ ادارت میں شامل ہوگیا۔ 15 مئی 1918ء کو اس کا عظیم افسانہ ''پاگل کی ڈائری'' اسی رسالے میں شائع ہوا۔ اس افسانے نے پورے چین کو ہلا کر رکھ دیا۔ کیوں کہ اس میں کہا گیا تھا کہ چین کا جاگیردارانہ معاشرہ آدم خوروں کا معاشرہ ہے جہاں ہر شخص دوسرے شخص کو کھا رہا ہے اور جو شخص اس آدم خوری کی نشاندہی کرے وہ ''پاگل'' کہلاتا ہے۔ اس کہانی نے فیوڈل پدرسری نظام کی تباہ کاریوں کو بے نقاب کیا، اور فیوڈل اخلاقیات کی اصلیت بتادی۔

چینی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی پوری سیاست چار مئی 1919 کی تحریک کی دانش ورانہ خمیر سے شروع کی۔ 4 مئی کی تحریک کنفیوشن ازم کی بجائے ایک ایسی ثقافت چاہتی تھی جو کہ مغربی ثقافت اور عقیدوں سے مشابہت رکھتی ہو۔ 1917 اور 1923 کے درمیان پروفیسروں، طالب علموں، دانشوروں اور انقلابیوں نے تحریک چلائی کہ مغربی سائنس، کلچر، اور جمہوری اصولوں کو اپنایا جائے۔ یہ لوگ جمہوریت اور سماجی مساوات کا مطالبہ کررہے تھے۔ یہ پانچ برس کا دورانیہ جسے کچھ لوگ ''چینی نشاۃ ثانیہ'' بھی کہتے ہیں۔ اس تحریک کو ''جدید ثقافتی تحریک'' کہتے ہیں۔ یہ لوگ نام نہاد، رواج و روایات و رسوم کو مسترد کررہے تھے۔

اس تحریک نے چینیوں، بالخصوص چینی طالب علموں کو سیاسی بنا ڈالا۔ ''جدید ثقافتی'' مفکروں نے حکومت، تعلیم، ثقافت، معیشت اور مغربی سائنس کے اپنے نظریات کتابوں اور رسالوں میں چھپوائے۔ اس کثیر تعداد میں اور اس قدر کھلے بندوں ایسا مواد چین کی پوری تاریخ میں نہ چھپا تھا۔ جلد ہی چینی طالب علم اپنے رسالے نکالنے لگے اور چین (فیوڈلزم) کی ہر روایت، ہر رواج پر ڈنڈے برسانے لگے۔ انہوں نے کنفیوشن ازم، شیاؤ، چینی کلاسیک اور جدید کنفیوشین سائنس پر تابڑتوڑ حملے کئے۔ ''جدید ثقافتی تحریک'' اور اس کے حامی طلباء نے چینی ثقافت کے کسی بھی حصے کو نہیں بخشا۔ انہوں نے چین کی ہر روایت کا مذاق اڑایا، ہر بات پہ تنقید کی۔ اس سرگرمی اور دانشورانہ ابھار نے ایک بڑے پیمانے کی بغاوت کو چنگاری دی اور چار مئی کی تحریک ابل پڑی۔

''4 مئی کی تحریک'' کا نقطہ عروج اس یقت پہنچا جب پہلی جنگ عظیم میں جاپان نے چین کے شانگ تنگ پر قبضہ کیا تھا۔ جنگ کے آخر میں جاپان نے شان تنگ اپنے پاس رکھنے پر اتحادی قوتوں کو مجبور کیا اور ''معاہدہ ورسیلیز'' پر دستخط ہوئے جس کے تحت یہ علاقہ جاپان کو مل گیا۔ 4 مئی 1919 کو اس معاہدے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور چین بھر میں قوم پرست جذبات بھڑکا دیئے۔ طلباء نے تیان من سکوائر پر بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا۔ یہ چینی تاریخ میں پہلا عوامی جلوس تھا۔ اس میں انہوں نے قومی آزادی، جمہوریت، لسانی اصلاحات، سائنس کی تدریس اور کنفیوشس فلسفہ اور توہمات سے رشتہ توڑنے کے مطالبات پیش کئے۔

لوہسون فیوڈل ازم کے بدترین دشمنوں میں سے تھا۔ وہ نہ صرف ان پڑھ عام انسان کی حالتِ زار بیان کرتا ہے جو کہ فیوڈل توہمات میں گھرا ہوا ہے بلکہ وہ پوری دیہی زندگی کی کبھی نہ بدلنے والی حالت کی بھی تصویر کشی کرتا ہے۔ چینی کسان لوہسون کے افسانوں کا مرکز ہے اور انہی کے حالات بدلنا اس کا مطمع نظر۔ کسان کی بھوک، اس کی کثرت اولاد، اس پہ مالیہ اور ٹیکسوں کا بوجھ ،جنگیں، ڈاکو، کرپٹ سرکاری افسر اور ظالم و ناترس جاگیردار۔ ان سب سے لوہسون کی دشمنی تھی۔

4 مئی کی تحریک کے اسباب و نتائج میں لوہسون کی کہانی ''پاگل کی ڈائری'' کے ساتھ ساتھ ''دوائی'' نامی کہانی بھی لوہسون کے غنی قلم سے نکلی کہانی تھی۔

لوہسون کے کسیلے پن، کسی حدتک ویسٹرنائزڈ سوچ و طرز اور چین کے فیوڈل روایات پر ہمہ وقت طنزیہ حملوں نے اسے چین کا سب سے بڑا تنقید نگار اور ادیب بنا دیا۔ اس کی ''آہ کیو کی سچی کہانی'' (1921)، چین میں 20 ویں صدی کے اوائل کی قدامت پسندی پر ایک تباہ کن تنقید تھی، یہ بھی 4 مئی کے زمانے کی نمائندہ تصنیف اور ایک بین الاقوامی کلاسیک قرار پائی۔

1921 ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس کی طرف امید کی نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ پارٹی نے چینی مزدور طبقے کے ساتھ مارکسزم کو مضبوطی سے جوڑتے ہوئے قبضہ گر جاپانیوں اور دیگر سامراجی قوتوں کے ساتھ علی الاعلان ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ لوہسون پیچھے رہ جانے والا کب تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ ''لٹریچر طبقاتی جدوجہد کا ہتھیار ہوتا ہے''۔

لوہسون نے 1925 کے آخر میں فکشن لکھنا ترک کر دیا اور پیکنگ سے شنگھائی منتقل ہونے کے بعد اپنی پوری تخلیقی قوت روسی لٹریچر کے ترجمے اور کاٹ ڈالنے والے طنزیہ مضامین لکھنے پر صرف کر دی۔ اور یہ دونوں اصناف اس کا ٹریڈ مارک بن گئے۔ بلاشبہ ترجمہ کسی بھی زبان کے ادب کے لیے آکسیجن مہیا کرتے رہنے کا ایک اہم وسیلہ ہوتا ہے۔ 1925ء میں خواتین یونیورسٹی پیکنگ کی طالبات نے کالج کے رجعت پرست صدر کے خلاف تحریک چلا کر اسے کالج سے نکال دیا۔ لو ہسون اس زمانے میں وہاں بطور استاد تعینات تھا۔ چنانچہ اس نے ان طالبات کی کھل کر حمایت کی ۔1926ء میں اسی یونیورسٹی کی ایک طالبہ دیگر نوجوانوں کے ساتھ جلوس میں ماری گئی تو لوہسون

نے اس کی یاد میں پرجوش مضامین لکھے۔ 1926 کے طلباء کی اس محبّ وطن تحریک کی طرفداری کرنے پر حکومت اس سے ناراض ہوئی اور اسے شہر بدر کیا گیا۔

وہ اب چینی کمیونسٹ پارٹی سے دل و جان سے محبت کرنے لگا تھا۔

اپریل 1927ء میں جب رجعتی کومنتانگ نے کمیونسٹوں کا قتلِ عام کیا اور سن یات سین یونیورسٹی کے بیشمار طلبہ کو گرفتار کر لیا تو لوہسون نے اجلاس بلوایا جس میں مطالبہ کیا کہ تمام طلبہ کو رہا کیا جائے۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو اس نے سن یات سین یونیورسٹی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اکتوبر 1927ء میں وہ شنگھائی چلا گیا۔

2 مارچ 1930ء کو اس نے چائنیز لیگ آف لیفٹ ونگ رائٹرز قائم کی۔ یہ لیگ شنگھائی میں بنی اور لوہسون اپنی موت تک اس کا چیف رہا۔ اس ''بائیں بازو کے مصنفین کی انجمن'' کے تاسیسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے لوہسون نے کہا کہ ''عوامی ادبی تحریک کا ایک مقصد یہ ہے کہ ادبی سپاہیوں کی ایک تازہ فوج پیدا کی جائے۔''

لُو ہسون نے نظمیں بھی لکھیں جو کہ سب کی سب نثری نظمیں ہیں۔ ان نظموں کا مجموعہ ''جنگلی گھاس'' کے نام سے موجود ہے۔ ان نظموں میں وہ سامراج اور شمالی وارلارڈز کے خلاف چینی عوام کی جدوجہد کے بارے میں اپنے احساسات بیان کرتا ہے۔ لوہسون کی کلیات نظم و نثر بیس جلدوں میں چینی اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے دیگر زبانوں کے ادب کے ترجمے بھی چینی زبان میں کیے ہیں۔

لوہسون پولیس کی مسلسل نگرانی کی وجہ سے ایک نیم روپوشی کی زندگی گزارتا رہا۔ چنانچہ اس نے 130 سے زائد قلمی ناموں سے مضامین لکھے۔ وہ ادب اور انقلاب کے درمیان تعلق قائم کرنے کے لئے لڑتا رہا۔

لوہسون نے ناول البتہ، کبھی نہ لکھا۔

لوہسون 19 اکتوبر 1936 میں شنگھائی میں پچپن برس کی عمر میں تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ اس کی قبر پہ جو کتبہ آویزاں ہے وہ اس کے بہت بڑے فین یعنی ماوزے تنگ

کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہے اور اس پہ جو کچھ لکھا ہے وہ کسی بھی قبر کا مختصر ترین کتبہ ہے:

''جناب لوہسون کی قبر''

تو اب میں پیش لفظ میں بھی یہی کچھ لکھ پاؤں گا:

''جناب لوہسون کے منتخب افسانے''

شاہ محمد مری

ماوند

چھ جولائی، 2016

افسانے

پاگل کی ڈائری

(یہ کہانی فیوڈل نظام کے خلاف لوہسون کا اولین اعلان جنگ تھا: مترجم)

وہ دو بھائی تھے، میں جن کا یہاں نام لینا مناسب نہیں سمجھتا۔ وہ دونوں ہائی سکول میں میرے دوست تھے مگر پھر بہت زمانوں تک ہم علیحدہ رہے اور باہم رابطہ نہ رکھ سکے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے سنا کہ ان میں سے ایک شدید بیمار ہے۔ میں اپنے پرانے گھر واپس جا رہا تھا۔ اس لئے میں راستے میں اپنا سفر توڑ کر اس کی مزاج پرسی کے لیے گیا۔ مگر وہاں مجھے صرف ایک بھائی ملا جس نے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی بیمار ہوا تھا۔

اس نے کہا'' تمہاری مہربانی کہ اتنی دور سے ہماری خیریت معلوم کرنے آئے ہو۔ لیکن میرا بھائی صحت یاب ہو کر اپنی سرکاری ڈیوٹی کے سلسلے پر کہیں اور چلا گیا ہے''۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے اپنے بھائی کی دو جلدوں پر مشتمل ڈائری تھما دی اور کہا کہ اسے پڑھنے سے اس کی بیماری کو نوعیت سمجھی جا سکتی ہے۔ اور تم چونکہ ہمارے پرانے دوست ہو اس لئے اس ڈائری کو پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

میں نے ڈائری لے لی اور پوری پڑھ ڈالی۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ اسے ایک نفسیاتی بیماری ہوئی تھی۔ اس کی تحریر بے ربط اور غیر واضح تھی اور اس نے بہت سے مبالغہ آمیز بیانات تحریر کئے تھے۔ علاوہ ازیں اس نے تاریخیں نہیں دی تھیں۔ سیاہی کی رنگت میں تبدیلی اور تحریروں میں فرق

سے ہی پتہ چلتا تھا کہ اس نے یہ تحریریں ایک ہی نشست میں نہیں لکھی تھیں۔ البتہ کچھ حصے بالکل بھی غیر مربوط نہ تھے۔ میں نے تحریر کا کچھ حصہ اپنے پاس نقل کر لیا تا کہ میڈیکل ریسرچ کا موضوع بن سکے۔ میں نے ڈائری میں درج اس کی ایک بھی نامعقولیت کو تبدیل نہیں کیا۔ میں نے صرف نام تبدیل کئے۔ حالانکہ اس میں جن لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سب کے سب دیہات کے ہیں، باقی دنیا انہیں نہیں جانتی اور ان کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے۔ جہاں تک عنوان کا تعلق ہے وہ ڈائری لکھنے والے نے صحت یاب ہونے کے بعد خود چنا تھا۔ اور میں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔

1

امشب چاند بہت روشن ہے۔

میں نے تیس سال سے ایسی چاندنی نہیں دیکھی۔ اس لئے آج جب میں نے ایسی چاندنی دیکھی تو مجھے غیر معمولی مسرت ہوئی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں پچھلے پورے تیس برسوں سے اندھیرے میں رہ رہا تھا۔ اب مجھے حد درجہ محتاط رہنا چاہیے۔ وگرنہ چاؤ کے گھر کا کتا مجھے دو دفعہ کیوں گھورتا؟

میرے اس خوف کے لیے میرے پاس دلائل موجود ہیں۔

2

آج رات چاندنی ہے ہی نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ بیماری کی علامت ہے۔ آج صبح جب میں احتیاطاً باہر گیا تو مسٹر چاؤ کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی، جیسے وہ مجھ سے خوفزدہ ہو، جیسے وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہو۔ وہاں سات آٹھ آدمی اور بھی تھے جو میرے بارے میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ اور انہوں نے جب دیکھا کہ میں ان کی طرف دیکھ رہا ہوں تو وہ بہت خوفزدہ ہوئے۔ میں جتنے لوگوں کے پاس سے گزرا وہ سب اسی طرح تھے۔ سب سے زیادہ خونخوار شخص نے مجھے دیکھ کر دانت پیسے۔ یہ جان کر کہ ان کی تیاریاں مکمل ہو چکیں، میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

میں اپنی راہ چلتا گیا۔ سامنے بچوں کا ایک غول بھی میرے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی وہی تاثر تھا جو مسٹر چاؤ کی آنکھوں میں تھا۔ ان کے چہرے بھی بھیانک حد تک زرد تھے۔ میں حیران تھا کہ ان بچوں کے دل میں میرے لئے کیا عداوت ہوسکتی ہے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں ان پر چیخ پڑا ''کیا بات ہے؟''۔ مگر وہ بھاگ گئے۔

میں حیران ہوں کہ مسٹر چاؤ کو میرے خلاف کیا عناد ہے، گلی کے لوگوں کو میرے ساتھ کیا عداوت ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی بات یاد نہیں سوائے اس کے کہ بیس برس قبل میں نے مسٹر کوشیو (1) کے کئی سال پرانے بہی کھاتے دیکھے تھے اور مسٹر ''کو'' بہت ناراض ہوئے تھے۔ گو کہ مسٹر چاؤ اسے نہیں جانتا، اس نے ضرور ان کھاتوں کی پڑتال کے بارے میں سنا ہوگا اور مجھ سے اس کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لئے وہ میرے خلاف گلی کے لوگوں کو ساتھ ملا کر سازش کر رہا ہے۔ مگر بچوں کو کیا ہوگیا؟۔ وہ تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ تو پھر وہ کیوں میری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے وہ مجھ سے خوفزدہ ہوں، جیسے وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہوں۔ یہی بات مجھے خوفزدہ کر رہی ہے۔ یہ واقعی پریشان کن اور تشویش ناک بات ہے۔

میں جانتا ہوں کہ انہوں نے یہ بات ضرور اپنے والدین سے سنی ہوگی۔

3

میں رات کو سو نہیں سکتا۔ اگر کسی چیز کو سمجھنا ہو تو لازم ہے کہ اس پہ بہت احتیاط سے غور کیا جائے۔

ان لوگوں میں سے کچھ کے ہاتھ مجسٹریٹوں نے شکنجوں میں کس دیئے تھے۔ کچھ نے مقامی اشرافیہ کے ہاتھوں منہ پہ تھپڑ کھائے تھے۔ ان کی بیویاں سرکاری افسر اٹھا لے گئے تھے۔ کچھ کے والدین نے قرض خواہوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔

وہ لوگ اس قدر خوفزدہ اور خونخوار کبھی دکھائی نہ دیئے جس طرح کہ وہ کل دکھائی دے رہے تھے۔

سب سے غیر معمولی بات تو کل گلی میں ہوئی۔ ایک عورت اپنے بیٹے پہ بپھر گئی اور کہا ''چھوٹے شیطان! میں اپنے غصہ کو کم کرنے کے لیے کئی بار تمہارا گوشت نوچ کھانا چاہتی ہوں!''۔ پھر وہ سارا وقت مجھے تکتی رہی۔ میں خود پہ قابو پانے کے قابل نہ تھا۔ ان سارے سبز چہروں اور بڑے دانتوں والے لوگوں نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے ہنسنا شروع کر دیا۔ بوڑھا چن تیزی سے آیا اور مجھے کھینچ کر گھر لے آیا۔

گھر میں موجود سب لوگوں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے جانتے نہ ہوں۔ ان کی آنکھوں میں وہی تاثرات تھے جو دوسروں کی آنکھوں میں تھے۔ جب میں مطالعہ گاہ کے اندر چلا گیا تو انہوں نے کمرہ باہر سے مقفل کر دیا جیسے کسی بطخ یا مرغی کو ڈربے میں بند کر رہے ہوں۔ اس واقعہ نے تو مجھے مزید حیران کر دیا۔

چند دن قبل ہمارے گاؤں سے ہمارا بزگر یہ خبر سنانے آیا کہ فصل خراب ہوگئی ہے۔ اس نے میرے بڑے بھائی کو بتایا کہ ان کے گاؤں کے ایک بدنام زمانہ شخص کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر کچھ لوگوں نے اس کا دل اور کلیجہ نکال لیا۔ انہیں گھی میں فرائی کیا اور کھا لیا تاکہ ان کی بہادری بڑھے۔ جب میں نے مداخلت کی تو میرا بھائی اور بزگر دونوں میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ یہ تو آج مجھے احساس ہوا کہ ان کی نظروں میں بھی وہی کچھ تھا جو کہ باہر کے لوگوں کی آنکھوں میں تھا۔

اس کے بارے میں سوچنا بھی سر کی چوٹی سے لے کر میرے پیروں کی ایڑیوں تک لرزہ طاری کرتا ہے۔

وہ انسانوں کو کھاتے ہیں اور ممکن ہے مجھے بھی کھا جائیں۔

مجھے اس عورت کی ''کئی بار تمہارا گوشت نوچنا''، وہ سبز چہروں، لمبے دانتوں والے لوگ اور پچھلے دن بزگر کی کہانی، سب کے سب خفیہ اشارے لگتے ہیں۔ ان کی باتوں میں زہر بھرا ہوا لگتا ہے۔ ان کی ہنسی، ان کے قہقہے خنجر جیسے لگتے ہیں۔ ان کے دانت سفید اور چمکدار ہیں۔ وہ سب آدم خور ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ میں برا آدمی نہیں ہوں، مگر جب میں نے مسٹر کیو کے بہی کھاتے دیکھے ہیں، معاملہ بہت نازک ہو گیا ہے۔لگتا ہے ان کے پاس راز ہیں جن کے بارے میں میں اندازہ نہیں کر سکتا۔اور جب وہ ایک بار ناراض ہو جائیں تو کسی کو بھی برا شخص قرار دے دیتے ہیں۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب میرے بڑے بھائی نے مجھے مضمون نویسی سکھائی۔خواہ کوئی شخص کتنا اچھا ہوتا، میں اگر اس کے برعکس دلیل پیش کرتا تو وہ اس عبارت پر پسندیدگی والا نشان لگاتا، جبکہ اگر میں برے آدمیوں کو معاف کرتا تو وہ کہتا: ''یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔اس سے مضمون کے اصل ہونے کا پتہ چلتا ہے''۔میں ان کے راز کیسے جان سکتا تھا خصوصاً جب وہ انسان کو کھا جانے پر تیار ہوں؟

جس چیز کو سمجھنا ہو اس پر محتاط غور کی ضرورت ہوتی ہے۔قدیم زمانوں میں لوگ عموماً انسان کھاتے تھے مگر اس کے بارے میں میری معلومات دھندلی ہیں۔میں نے اس پر غور کرنے کی کوشش کی مگر میری تاریخ میں کوئی تسلسل نہیں اور ہر صفحہ پر ہر جگہ یہ الفاظ بے ترتیبی سے لکھے ہوئے ہیں: ''نیکی اور اخلاقیات''۔چونکہ مجھے کسی طور نیند نہیں آتی تھی اس لئے میں آدھی رات تک پڑھتا رہتا تھا، اس وقت تک جب تک کہ مجھے بین السطور لفظ نظر آنے لگے۔پوری کتاب ان دو الفاظ سے بھری ہوئی تھی: ''آدم خور''۔

کتاب میں بھی یہی باتیں لکھی ہیں، ہمارے بزرگ کی کہی باتیں بھی یہی ہیں، میری طرف ایک ناقابل فہم مسکان کے ساتھ گھورتی نگاہیں بھی یہی پیغام دیتی ہیں۔

میں بھی ایک آدمی ہوں۔اور وہ مجھے کھانا چاہتے ہیں۔

4

صبح کو میں کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔بوڑھا ''چن'' دوپہر کا کھانا لایا۔ایک کٹورا سبزی، ایک کٹورا ابلی ہوئی مچھلی۔مچھلی کی آنکھیں سفید اور سخت تھیں اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔انہی لوگوں کی طرح جو انسانوں کو کھانا چاہتے ہیں۔کچھ نوالے کھانے کے بعد میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ آیا پھسلن والے وہ لقمے مچھلی کے تھے یا انسانی گوشت کے۔میں نے یہ سب قے کر کے اگل دیا۔

میں نے کہا: ''چن چاچا۔میرے بھائی کو بتا دینا کہ میرا دم گھٹنے لگا ہے اور میں باغ میں گھومنا چاہتا ہوں''۔چاچا چن خاموشی سے باہر چلا گیا اور جلد ہی واپس آ کر اس نے گیٹ کھول دیا۔

میں ہلا نہیں۔دیکھتا رہا کہ وہ مجھ سے کیا سلوک کرتے ہیں۔مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے باہر جانے نہیں دیں گے۔پھر کیا دیکھتا ہوں کہ میرا بڑا بھائی ایک بوڑھے کو لے کر آہستہ آہستہ آنے لگا۔اس بڈھے کی آنکھوں میں قاتلوں والی چمک تھی، اور اس ڈر سے کہ کہیں میں یہ چمک دیکھ نہ لوں اس نے سر جھکا لیا اور اپنی عینک کے کونے سے چوری چوری مجھے دیکھنے لگا۔

''تم آج بہت بہتر لگتے ہو'' میرا بھائی بولا۔

''ہاں'' میں نے کہا۔

''میں نے مسٹر ہو کو یہاں تکلیف دی ہے تاکہ وہ تمہارا معائنہ کرے''۔میرا بھائی بولا۔

''ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔

دراصل میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بوڑھا آدمی بدلے ہوئے بھیس میں قاتل تھا۔وہ صرف یہ جاننے کے لیے میری نبض دیکھ رہا تھا کہ میں کتنا موٹا ہوں۔اس لئے کہ ایسا کر کے اسے میرے گوشت میں سے حصہ مل سکتا تھا۔میں خوفزدہ نہ تھا۔گو کہ میں آدم خوروں میں نہیں ہوں، لیکن میرا حوصلہ ان کے حوصلوں سے بہت بڑا ہے۔میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کرتا ہے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے۔بوڑھا بیٹھ گیا، اپنی آنکھیں بند کر لیں، کچھ دیر تک ٹٹولتا رہا اور کچھ دیر تک ساکن و جامد رہا۔پھر اپنی عیار آنکھیں کھولیں اور بولا ''اپنے خیالات منتشر ہونے نہ دو۔چند دن خاموشی کے ساتھ آرام کرو۔اور تم ٹھیک ہو جاؤ گے''۔

آرام کروں، اچھا!۔جب میں اچھی طرح موٹا تازہ بن جاؤں تو ظاہر بات ہے انہیں کھانے کو زیادہ گوشت ملے گا۔مگر مجھے اس کا کیا فائدہ ہوگا۔اور یہ سب کچھ ''ٹھیک'' کیسے ہوگا۔یہ لوگ انسانی گوشت کھانا چاہتے ہیں اور بہ یک وقت رازداری قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اور فوراً عمل کرنے کی جرات نہیں کر رہے ہیں۔میں قہقہہ لگانے والا تھا۔میں اپنی ہنسی کی غراہٹ کو دبا نہ سکا۔مجھے ان پہ بہت ہنسی آ رہی تھی۔میں جانتا تھا کہ اس ہنسی میں جرات اور وقار تھا۔بوڑھا آدمی

اور میرا بھائی دونوں پیلے پڑ گئے ،انہیں میری جرات اور وقار نے دہشت زدہ کر دیا تھا۔

مگر وہ صرف اس لئے مجھے کھا ڈالنے میں زیادہ سرگرم ہیں کہ میں بہادر ہوں۔ تا کہ وہ میری بہادری میں سے کچھ حاصل کر سکیں ۔ بوڑھا باہر چلا گیا مگر اس سے قبل کہ وہ دور چلا جاتا اس نے آہستگی سے میرے بھائی سے کہا: ''فوری طور پر کھایا جائے''۔ اور میرے بھائی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچھا تو تم بھی اس میں شامل ہو، یہ حیرت انگیز انکشاف گو کہ ایک صدمے کی طرح آیا مگر میری توقعات کے برعکس نہ تھا۔ مجھے کھا جانے کے منصوبے میں میرا بھائی شریک ہے!

انسانی گوشت کھانے والا میرا بڑا بھائی ہے!

میں انسانی گوشت کھانے والے کا چھوٹا بھائی ہوں!

خود مجھے دوسرے لوگ کھا جائیں گے مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ میں انسانی گوشت کھانے والے کا چھوٹا بھائی ہوں!۔

5

ان چند دنوں سے میں متواتر سوچتا رہا: فرض کرو بوڑھا بھیس بدلے ہوئے قاتل کے بجائے اصلی ڈاکٹر تھا۔ مگر پھر بھی وہ انسانی گوشت کھانے والا تھا۔ اس کے پیش رو ''لی شی چین'' نے اپنی لکھی جڑی بوٹیوں والی اس کتاب میں صاف صاف لکھا ہے کہ انسانی گوشت کو ابال کر کھایا جا سکتا ہے۔ تو کیا وہ بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ انسانی گوشت نہیں کھاتا؟۔

جہاں تک میرے بڑے بھائی کا تعلق ہے، میرے پاس اس پہ شک کرنے کا جواز موجود ہے۔ جب وہ مجھے پڑھا رہا تھا تو اس نے خود بتایا تھا کہ ''لوگ کھانے کے لیے اپنے بیٹے ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کیا کرتے تھے''۔ ایک بار ایک برے شخص کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ نہ صرف قتل کئے جانے کا مستحق تھا بلکہ اس کا ''تو گوشت کھانا چاہیے اور اس کی کھال پر سو جانا چاہیے۔۔۔۔''۔ میں اُس وقت ابھی کمسن تھا اور کچھ دیر کے لیے خوف کے مارے میرے دل کی دھڑکن تیز رہی۔ جب پچھلے دن گاؤں سے آئے ہوئے ہمارے بزگر نے ایک آدمی

کا دل اور کلیجہ کھانے کا وقعہ سنایا۔ تو وہ اس سے بالکل حیران نہ ہوا بلکہ اپنا سر اثبات میں ہلاتا رہا۔ میں ماضی میں اس کی وضاحتیں محض سنتا تھا، بس۔ اب میں جانتا ہوں کہ جب وہ مجھ سے اس کی وضاحت کر رہا ہوتا تو اس کے ہونٹوں کے کناروں پر نہ صرف انسانی چربی تھی بلکہ اس کا دل مجھے کھانے کے لیے للچا رہا ہوتا۔

6

گھپ اندھیرا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ رات ہے یا دن۔ چاؤ خاندان کے کتے نے پھر بھونکنا شروع کر دیا۔

شیر کی خونخواری، خرگوش کی بزدلی، لومڑی کی مکاری............

7

میں ان کے طور طریقے جان گیا ہوں۔ وہ یک دم قتل نہیں کرتے، نہ ہی وہ اس کی جرات کرتے ہیں، وہ اس کے نتائج سے ڈرتے ہیں۔ وہ آپس میں مل گئے ہیں اور انہوں نے ہر جگہ جال بچھا رکھے ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کہ خودکشی کر لوں۔ کچھ روز قبل گلی میں مردوں اور عورتوں کا رویہ، اور ان چند آخری دنوں سے میرے بھائی کا رویہ اس بات کو بہت واضح کر دیتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی آدمی اپنا بیلٹ اتارے اور اس کے ذریعے چھت سے لٹک کر خودکشی کر لے۔ اس طرح ان کے دلوں کی مراد، قتل کا الزام لگے بغیر، پوری ہو جاتی ہے۔ فطری طور پر، وہ اس تصور پر خوشی سے قہقہے لگاتے ہیں۔ دوسری طرف اگر کوئی موت سے خوفزدہ یا پریشان ہو، تو گو کہ وہ اس خوف سے لاغر ہو جاتا ہے مگر وہ پھر بھی اثبات میں سر ہلاتے ہیں۔ وہ صرف لاش کا مردہ گوشت کھاتے ہیں۔ میں کہیں کسی مکروہ درندے کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ جس کی آنکھیں کریہہ لگتی ہیں۔ اس کا نام لگڑ بھگڑ ہے۔ وہ بھی مردہ گوشت کھاتا ہے۔ وہ بڑی بڑی ہڈیوں کو چیچ چیچ کر ٹکڑے ٹکڑے کرتا جاتا ہے، اور نگلتا جاتا ہے۔ اس عمل کا تصور بھی خوفزدہ کر جاتا ہے۔ لگڑ بھگڑ بھیڑیوں جیسے ہیں

اور بھیڑیئے کتے کی نسل سے ہیں۔ پچھلے دن چاؤ کے گھر کے کتے نے کئی بار مجھے گھورا۔ ظاہر ہے وہ بھی اس سازش میں شامل ہے اور ان کے ساتھ مل گیا ہے۔ اس بوڑھے نے نظریں تو جھکا دی تھیں مگر وہ نظریں مجھے دھوکہ نہیں دے پائیں!

سب سے زیادہ افسوس تو میرے بڑے بھائی پہ ہے۔ وہ بھی ایک انسان ہے، تو وہ کیوں خوفزدہ نہیں ہے۔ وہ کیوں دوسروں سے مل کر مجھے کھانے کی سازشیں کر رہا ہے۔؟ کیا ایسا ہے کہ جو کوئی بھی اس کا عادی بن جائے وہ پھر اسے جرم نہیں سمجھتا؟۔ یا پھر اس کا دل اتنا سخت ہو گیا ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ جرم ہے، مگر کرتا ہے؟۔

آدم خوروں کو بد دعائیں دینے کا آغاز میں اپنے بھائی سے کروں گا۔ اور آدم خوروں کو منع کرنے کا آغاز بھی میں اپنے بھائی سے کروں گا۔

8

دراصل، ایسے دلائل سے انہیں بہت پہلے قائل ہو جانا چاہیے تھا۔۔۔

اچانک کوئی اندر آ گیا۔ وہ صرف 20 برس کا تھا اور میں اس کی شکل واضح طور پر نہ دیکھ سکا۔ اس کا چہرہ مسکراہٹوں سے مزین تھا مگر جب اس نے مجھے سلام کیا تو اس کی مسکراہٹ حقیقی نہیں لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا انسانوں کو کھانا اچھی بات ہے؟''۔

وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ اس نے جواب دیا ''جبکہ کوئی قحط نہیں ہے تو انسانوں کو کیسے کھایا جا سکتا ہے؟''۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ بھی انہی میں سے ہے۔ مگر پھر بھی میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھا:

''کیا یہ جائز ہے؟''۔

''آپ ایسی بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟ آپ یقیناً۔۔۔ مذاق کرنے کے شوقین ہیں ۔۔۔ آج موسم بہت اچھا ہے''۔

''آج موسم بہت اچھا ہے۔ چاندنی روشن ہے مگر میں تم سے پوچھتا ہوں۔ کیا یہ جائز ہے؟''

وہ لاتعلق لگا اور بڑبڑایا: ''نہیں۔۔۔''

''نہیں؟۔ تو پھر وہ اب بھی ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

''آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟''۔

''میں کیا باتیں کر رہا ہوں۔ وہ اب بھی گاؤں میں آدمیوں کو کھا رہے ہیں۔ اور ساری کتابوں میں یہی لکھا ہوا ملتا ہے، تازہ سرخ روشنائی میں......''

اس کے تاثرات بدل گئے اور وہ بھیانک طور پر پیلا پڑ گیا۔

''ہو سکتا ہے' اس نے مجھ پہ نظریں گاڑتے ہوئے کہا'' ''ہمیشہ سے ایسا رہا ہے ......''۔

''کیا یہ اس لئے جائز ہے کہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہے؟''

''میں آپ سے مزید ایسی باتیں کرنا چاہتا، آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، جو کوئی بھی ایسی باتیں کرتا ہے غلط کرتا ہے''۔

میں اچھل پڑا، میری آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں۔ مگر وہ آدمی بھاگ گیا۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔ وہ عمر میں میرے بڑے بھائی سے بہت چھوٹا تھا مگر پھر بھی اس سازش میں شامل تھا۔ اسے یقیناً والدین نے یہ سبق دیا ہوگا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کو بھی ابھی سے یہی سکھایا ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ بچے میری طرف اس قدر خونخواری سے دیکھتے ہیں۔

9

وہ آدمی کو کھانا چاہتے ہیں، اور یہ بہ یک وقت اپنے کھائے جانے کے خوف میں بھی مبتلا ہیں، وہ سب ایک دوسرے کو شک سے دیکھتے ہیں۔۔۔

اگر وہ اپنی جان اس جنون سے چھڑا لیں تو اُن کی زندگی پر سکون ہو گی اور وہ آرام سے کام کرنے لگیں گے۔ گھومنے پھرنے لگیں گے۔ کھانے پینے اور سونے لگیں گے۔ انہیں محض یہی ایک

قدم اٹھانا ہوگا۔مگر باپ بیٹے ،میاں بیوی ، بھائی ،دوست ،اساتذہ ،اورطلباء دشمن اورحتی کہ اجنبی سب کے سب اس سازش میں شامل ہو چکے ہیں اور یہی ایک قدم اٹھانے سے ایک دوسرے کو منع کر رہے ہیں۔

10

میں آج صبح اپنے بڑے بھائی کو ملنے گیا۔وہ ہال کے دروازے کے باہر کھڑا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔میں اس کے قریب گیا اور احتیاط اور نرمی سے اس سے کہا:

''بھائی، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے''

''اچھا، کیا ہے؟''۔اس نے فوراً میری طرف مڑتے ہوئے اور سر ہلاتے پوچھا۔

''بات تو معمولی ہے مگر مجھے کہتے ہوئے دشواری ہو رہی ہے۔ بھائی! شاید سارے قدیم لوگ شروع شروع میں تھوڑا سا انسانی گوشت کھاتے تھے۔بعد میں ان کا نکتہ نظر تبدیل ہوا تو ان میں سے کچھ نے کھانا چھوڑ دیا اور اچھا بننے کی کوشش کی تو وہ انسان میں تبدیل ہو گئے۔مگر کچھ ابھی بھی انسانی گوشت کھا رہے ہیں۔۔۔ رینگنے والے جانوروں کی طرح۔کچھ مچھلی میں تبدیل ہو گئے، کچھ پرندوں ،بندروں میں اور آخر کار انسانوں میں۔مگر، کچھ اچھا بننے کی کوشش نہیں کرتے اور ابھی تک رینگنے والے جانور ہی ہیں۔کیا وہ لوگ جو انسان کھاتے ہیں اپنا موازنہ اُن سے کریں گے جو انسان نہیں کھاتے۔وہ کس قدر شرمندہ ہوں گے؟۔شاید رینگنے والے جانوروں کا بندروں کے سامنے شرمسار ہونے سے بھی زیادہ۔

''قدیم زمانوں میں ''یی یا''(2) نے اپنا بیٹا ابال کر حاکم وقت چی اور چاؤ کو کھانے کے لیے پیش کیا۔یہ پرانی کہانی 685 سے 643ق۔م کی ہے۔مگر ''پان کو'' نے جب سے آسمان اور زمین بنائے اس وقت سے انسان ایک دوسرے کو کھاتے رہے ہیں۔''یی یا'' کے بیٹے کے زمانے سے لے کر ''سوسی لن''(3) کے زمانے تک،اور سوسی لن سے لے کر ہمارے گاؤں میں پکڑے گئے آدمی تک۔۔۔پچھلے سال انہوں نے شہر میں ایک مجرم کو پھانسی چڑھایا اور تپدق کے ایک مریض

نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے خون میں ڈبو کر کھالیا۔

''وہ مجھے کھانا چاہتے ہیں۔اور بلاشبہ آپ اکیلے اِس بارے میں کچھ نہیں کر سکتے۔مگر آپ اُن کے ساتھ شامل کیوں ہوتے ہیں؟۔آدم خوروں کی حیثیت سے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں ۔اگر وہ مجھے کھا سکتے ہیں تو آپ کو بھی کھا سکتے ہیں۔ایک ہی گروپ کے یہ ممبر،ایک دوسرے کو بھی نہیں بخشتے۔لیکن اگر آپ خود کو بدل دیں تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔گو کہ یہ عمل قدیم زمانوں سے چلا آ رہا ہے مگر آج ہم بہتر بننے کے لیے ایک خصوصی کوشش کر سکتے ہیں۔اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہ کیا جائے!۔مجھے یقین ہے بھائی کہ آپ ایسا کر سکتے ہیں۔

''پچھلے دن جب بزگر نے زمین کا کرایہ کم کرانا چاہا تو آپ نے کہا تھا''یہ ہوسکتا ہے''۔

پہلے تو وہ زہریلی مسکراہٹ مسکرایا۔پھر اس کی آنکھوں میں ایک مہلک چمک آ گئی اور جونہی نے میں ان کے راز کی بات کھول دی تو اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔باہر گیٹ پر لوگوں کا ایک گروہ کھڑا تھا جس میں مسٹر چاؤ اور اس کا کتا بھی موجود تھے۔وہ سب اندر دیکھنے کے لیے اپنی گردنیں لمبی کر کر کے جھانک رہے تھے۔میں ان سب کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے کہ لگتا تھا کہ انہوں نے اپنے چہروں پر کپڑوں کے ماسک چڑھا رکھے تھے۔پھر بھی ان میں سے کچھ پیلے اور بھیانک لگ رہے تھے اور وہ اپنی ہنسی چھپا رہے تھے۔میں جانتا تھا کہ وہ سب ایک ہی طرح نہیں سوچتے ۔ان میں سے کچھ سوچتے تھے کہ چونکہ ہمیشہ سے اسی طرح چلا آ رہا ہے،لہذا آدمی کھانے چاہئیں ۔کچھ سوچتے تھے کہ انہیں آدمی نہیں کھانے چاہئیں مگر پھر بھی کھا جاتے۔اور وہ خوفزدہ تھے کہ کہیں اُن کا راز افشاں نہ ہو جائے۔لہذا جب انہوں نے میری آواز سنی تو وہ ناراض ہو گئے۔پھر بھی ان کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

اچانک میرا بھائی غضبناک اور بلند آواز میں چیخا:

''تم سب یہاں سے نکل جاؤ!ایک پاگل کا تماشا دیکھنے میں تمہیں کیا ملتا ہے؟''۔

تب مجھے ان کی مکاری کا پتہ چلا۔وہ اپنا موقف بدلنے کے لیے کبھی راضی نہ ہوں گے ۔اور ان کی منصوبہ بندی مکمل ہو گئی تھی۔انہوں نے مجھے پاگل مشہور کر دیا۔۔۔۔بعد میں جب میں

کھا لیا جاؤں گا تو نہ صرف یہ کہ کوئی مسئلہ نہ ہوگا بلکہ لوگ شاید ان کے احسان مند ہوں گے۔ ہمارے بزرگ نے گاؤں والوں کا ایک بدمعاش کو کھانے والا واقعہ سنایا تھا۔تو وہ بھی ہو بہو یہی طریقہ تھا۔یہ ان کی پرانی چال ہے۔

بوڑھا چن بھی بڑے سکون سے اندر آیا۔مگر وہ میرا منہ بند نہیں کر سکتے تھے۔مجھے ان لوگوں سے حتماً یہی کہنا تھا۔میں نے ان سے کہا:

’’تمہیں بدلنا چاہیے،اپنے دل کی گہرائیوں سے تبدیل ہونا چاہیے!۔تم سب جانتے ہو کہ مستقبل میں اس دنیا کے اندر آدم خوروں کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔‘‘

بوڑھے چن نے سب لوگوں کو باہر بھگا دیا۔میرا بھائی غائب ہو چکا تھا۔بوڑھے چن نے مجھے واپس کمرے میں جانے مشورہ دیا۔کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔شہتیر اور کڑیاں میرے سر کے اوپر جھٹکے کھا رہے تھے۔کچھ وقت تک ہلتے رہنے کے بعد وہ بڑی ہوتی گئیں۔وہ میرے اوپر گرتے گئے گرتے گئے۔۔۔

وزن اس قدر بھاری تھا کہ میں ہل نہیں سکتا تھا۔ان کا مقصد یہ تھا کہ میں مر جاؤں۔ میں جانتا تھا کہ یہ وزن باطل اور مصنوعی ہے۔اس لئے میں نے جدوجہد کی اور باہر نکل آیا۔میں ہانپ رہا تھا،پسینے سے شرابور تھا۔مگر مجھے یہ کہنا تھا۔میں اونچی آواز میں کہہ اٹھا:

’’تمہیں یک دم تبدیل ہونا چاہیے،اپنے دل کی گہرائیوں سے تبدیل ہونا چاہیے ۔تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مستقبل میں دنیا کے اندر آدم خوروں کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔۔۔‘‘

11

سورج نہیں چمکتا۔دروازہ نہیں کھلتا۔ہر روز دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے۔

میں نے اپنے’’چاپ سٹک‘‘ اٹھائے،پھر اپنے بڑے بھائی کے بارے میں سوچا۔میں جانتا ہوں کہ میری بہن کس طرح مر گئی۔وہ اسی کے ہاتھوں مر گئی تھی۔میری بہن اس وقت محض پانچ برس کی تھی۔مجھے ابھی تک یاد ہے کہ وہ بہت پیاری اور خوبصورت تھی۔ماں روتی رہی۔روتی

رہی۔مگر وہ اس سے التجائیں کرتا رہا کہ وہ نہ روئے۔شاید اس لئے کہ اس نے خود اُسے کھا لیا تھا ۔اس لئے ماں کا رونا اُسے شرمندہ کر رہا ہوگا۔اگر اس میں شرم کا کوئی احساس تھا تو۔۔۔

میری بہن کو میرے بھائی نے کھا لیا تھا۔مگر مجھے معلوم نہیں کہ اس بات کا ماں کو پتہ تھا یا نہیں۔

میرا خیال ہے ماں کو معلوم تھا مگر جب وہ رو رہی تھی تو اس نے ایسا صاف صاف کہا نہیں۔شاید وہ بھی اس کام کو جائز سمجھتی ہوگی۔مجھے یاد ہے جب میں چار پانچ برس کا تھا۔تو بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کسی آدمیء کے والدین بیمار ہوں تو اُسے اپنے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر اُن کے لیے ابالنا اور انہیں کھلانا چاہیے۔تب ہی وہ اچھا بیٹا سمجھا جاتا۔اور ماں نے اس کی تردید نہیں کی تھی۔ اگر ایک ٹکڑا کھایا جا سکتا ہے تو ظاہر ہے پورا بھی کھایا جا سکتا ہے۔اور اس کے باوجود ماتم کرنے کا تصور بھی مجھے خون کے آنسو رلاتا ہے۔یہ اس کے لیے غیر معمولی بات ہے۔

12

میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ میں نے یہ سارے سال ایک ایسی جگہ پر گزارے جہاں لوگ چار ہزار برس سے انسانی گوشت کھاتے چلے آرہے ہیں۔میرے بھائی نے گھر کا چارج سنبھالا ہی تھا کہ ہماری بہن مر گئی۔اور اس نے یقیناً اس کا گوشت ہمارے چاول اور دوسری ڈشوں میں استعمال کیا تھا اور ہمیں بے خبر رکھ کر کھلایا تھا۔

یہ ممکن ہے کہ میں نے انجانے میں اپنی بہن کے گوشت کے کئی ٹکڑے کھائے تھے اور اب میری باری تھی۔۔۔

میری طرح کا آدمی مردم خوری کی چار ہزار سالہ تاریخ کے بعد۔۔۔حالانکہ مجھے اس کے بارے میں پہلے کچھ پتہ نہ تھا۔۔۔اصل انسان کا سامنا کرنے کی امید کبھی کیونکر کر سکتا تھا؟

شاید ابھی چند بچے ایسے ہوں گے جنہوں نے انسان نہیں کھائے، ان بچوں کو بچاؤ!!

حواشی

1۔کوشیو کا مطلب ہے ''قدیم زمانہ''۔لوہسون کے ذہن میں چین کے اندر فیوڈل مظالم کی طویل تاریخ تھی۔

2۔یی یا نے اپنا بیٹا ڈیوک ہوآن کے سامنے رکھا تھا نہ کہ چی اور چاؤ کے۔ڈیوک ہوآن 685-63 ق تک حکمرانی کرتا رہا۔پاگل سے یہاں حاکم کا نام لکھنے میں غلطی سرزد ہوگئی۔

3۔سوسی لن، چنگ عہد سلطنت (1644 تا 1911) کے اواخر کا ایک انقلابی تھا۔اسے 1907 میں ایک افسر کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی اور اس کا دل اور کلیجہ کھا لیے گئے۔

کُنگ آئی چی

لوچن کے شراب خانے چین کے دیگر علاقوں کی طرح نہیں ہوتے۔ان سب کے کاؤنٹر گلی کی طرف قائمہ زاویہ بناتے ہیں جہاں شراب کو گرم کرنے کیلئے پانی تیار رکھا ہوتا ہے۔مرد لوگ دوپہر اور شام کو کام سے آجاتے ہیں اور شراب کا کٹورا خریدتے ہیں۔اس کی قیمت بیس برس قبل چار سکّے ہوا کرتے تھے مگر اب یہ دس سکّوں میں پڑتا ہے۔خریدار کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر گرم شراب پیتے ہیں اور فرحت پاتے ہیں۔ایک اور سکہ خرچ کر کے وہ شراب کے ساتھ ساتھ بانس کی کونپلوں کی ایک نمکین پلیٹ یا مٹر کی ایک پلیٹ خرید لیتے ہیں۔جبکہ بارہ سکّے دے کر آپ گوشت کی ایک پلیٹ لے سکتے ہیں۔مگر یہاں گاہکوں کی اکثریت چھوٹے کوٹ والے طبقے سے تعلق رکھتی ہے جن سے چند افراد ہی گوشت خرید سکتے ہیں۔صرف لمبے لمبے چوغے والے ہی شراب اور گوشت کا آرڈر دینے کے لیے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور بیٹھ کر مزے سے شراب پیتے ہیں۔

میں نے بارہ برس کی عمر میں اس شراب خانے میں ویٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔
شراب خانے کے مالک نے کہا کہ میں اتنا عقلمند نہیں ہوں کہ لمبے چوغوں والے گاہکوں کو سرو کر سکوں اس لئے اس نے مجھے بیرونی کمرے میں کام پر لگا دیا۔گو کہ چھوٹے کوٹ والے گاہکوں میں زیادہ تر لوگ آسانی سے خوش ہوتے تھے مگر ان میں سے چند افراد بھی مشکل پیدا کرتے تھے۔وہ ڈونگے کی مدد سے زرد شراب کو پیپے سے نکالتے ہوئے خود دیکھنے پہ اصرار کرتے تھے۔وہ یہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ شراب کے برتن کے پیندے میں پانی تو نہیں ہے۔وہ برتن کو گرم پانی میں

ڈبونے کے عمل کا بھی خود معائنہ کرنے پہ اصرار کرتے تھے۔اس قدر گہری نگرانی کے ہوتے ہوئے شراب میں پانی ملا دینا بہت مشکل کام تھا۔اس لیے کچھ ہی دن بعد مالک نے فیصلہ کیا کہ میں اس کام کے لیے بھی موزوں نہ تھا۔چونکہ خوش قسمتی سے میری سفارش ایک بااثر شخص نے کر رکھی تھی اس لیے وہ مجھے برخاست نہیں کرسکتا تھا۔البتہ اس نے مجھے شراب کو گرم کرنے کے پھیکے کام پہ ٹرانسفر کر دیا۔

اس کے بعد میں سارا دن کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا اپنے کام میں مصروف رہتا۔گو کہ میں اس کام سے مطمئن تھا مگر یہ کام مجھے بہت یکساں اور فضول محسوس ہوا۔

ہمارا مالک ایک درشت آدمی تھا،اور گاہک اکھڑ لوگ تھے۔اس لیے وہاں پر انسان کا ہنس مکھ رہنا ناممکن تھا۔میں صرف اسی وقت تھوڑا ہنس سکتا تھا جب کُنگ آئی چی شراب خانے آجاتا۔یہی وجہ ہے کہ میں اب بھی اسے یاد کرتا ہوں۔کُنگ لمبے چوغوں والے گاہکوں میں سے وہ واحد شخص تھا جو کھڑے ہو کر شراب پیتا تھا۔وہ بڑا بھدا آدمی تھا جس کے چہرے کی جھریوں میں زخموں کے نشان نظر آتے تھے۔اس کی لمبی اور خود رو قسم کی داڑھی تھی جس میں سفید بالوں کی دھاریاں تھیں۔گو کہ اس نے لمبا چوغہ پہنا ہوتا تھا مگر یہ بہت میلا تھا اور بوسیدہ ہو چکا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے اس نے دس برس سے اسے دھویا نہ ہو۔وہ اپنی گفتگو میں اس قدر زیادہ پرانے محاورے استعمال کرتا تھا کہ اس کی باتوں کا آدھا حصہ سمجھ ہی نہ آتا۔اس کا خاندانی نام کُنگ تھا مگر اس پر کُنگ آئی چی کا بگڑا ہوا نام رکھا گیا۔وہ جب بھی دکان آجاتا ہر شخص اس کی طرف دیکھتا اور اس کا مذاق اڑاتا۔کوئی پکار اٹھتا:

''کُنگ آئی چی، تمھارے چہرے پر کچھ زخم تازہ ہیں!''

کُنگ اس تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے گرم شراب کے دو کٹوروں اور مٹر کی ایک پلیٹ کا آرڈر دینے کاؤنٹر پر آجاتا۔اس کے لیے وہ نو سکّے دے دیتا۔کوئی دوسرا جان بوجھ کر بلند آواز میں کہتا:

''تم نے پھر چوری کی ہوگی''۔

''کیوں ایک نیک نام شخص کو بے بنیاد بدنام کرتے ہو؟'' وہ اپنی آنکھیں مکمل کھولتے ہوئے پوچھتا۔

''ہونہہ۔نیک نام!۔ارے پرسوں میں نے اپنی آنکھوں سے تمھیں 'ہو' خاندان سے کتابیں چوری کرنے پر لٹکتے اور مار کھاتے دیکھا ہے!''

کُنگ کا رنگ سرخ ہو جاتا،اس کی پیشانی کی رگیں پھول جاتیں اور وہ کہتا:

''کتاب اٹھانا چوری نہیں ہوتی......... کتاب اٹھانا ایک عالمانہ فعل ہے اسے چوری نہیں کہا جا سکتا!''۔اس نے پھر کلاسیک میں سے کئی اقوال زریں سنائے،مثلاً ''شریف شخص غربت میں بھی اپنا وقار برقرار رکھتا ہے'' ....اس نے محاوروں کا ایک پورا ریوڑ سنا ڈالا۔پورا مجمع اس پر قہقہے لگا رہا تھا اور سارا شراب خانہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

میں نے افواہیں سن رکھی تھیں کہ کُنگ آئی چی نے قدیم ادب پڑھ رکھا تھا مگر سرکاری امتحان کبھی پاس نہ کیا تھا۔گزر بسر کے لئے اس کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے اس لیے وہ غریب سے غریب تر ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ عملاً ایک بھکاری کی حد تک تنگ دست ہو گیا۔حالانکہ وہ ایک اچھا خطاط تھا اور اپنا گزارہ اچھی طرح کرسکتا تھا۔مگر بدقسمتی سے اس میں ناکامیاں تھیں۔وہ شراب پیتا تھا اور کاہل تھا۔اس لیے چند دنوں بعد وہ غائب ہو جایا کرتا۔بار بار یہ حرکت کرنے کے بعد اب کوئی شخص اسے کام نہ دیتا۔اس لیے کبھی کبھار چوری کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور متبادل نہ رہا۔ہمارے شراب خانے میں اس کا رویہ مثالی ہوتا تھا۔وہ ہمیشہ نقد ادائیگی کرتا۔البتہ کبھی کبھی اس کا نام قرضداروں کے بورڈ پر نظر آتا۔لیکن ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں وہ ادائیگی کر دیا کرتا اور اس کا نام بورڈ سے صاف کیا جاتا تھا۔

آدھا کٹورا شراب پینے کے بعد کُنگ دوبارہ پرسکون ہو جاتا۔مگر پھر کوئی پوچھ بیٹھتا:

''کُنگ آئی چی، تم واقعی پڑھنا جانتے ہو؟''۔جب لگتا کہ کُنگ یوں جتا رہا ہے جیسے اس سے ہتک آمیز سوال کیا گیا ہے تو وہ بات جاری رکھتے ہوئے پوچھتے:

''تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم نے نچلے سے نچلا امتحان تک بھی پاس نہیں کیا؟''

اس پہ کُنگ ملول اور بے چین ہو جاتا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ جاتا اور اس کے ہونٹ کانپنے لگتے۔ مگر وہ پھر کلاسیکل ادب کے وہی بے ہودہ ٹکڑے ہی بیان کر پاتا اور ہر شخص دوبارہ قہقہے لگانے لگتا۔ سارا شراب خانہ ایک بار پھر مسرت سے بھر جاتا۔

ایسے موقعوں پر میں بھی ہنسی میں شامل ہو سکتا تھا، مالک صرف اس ہنسی میں میری شرکت پر نہیں ڈانٹتا تھا۔ دراصل ہنسی پیدا کرنے کیلئے وہ خود ہی کُنگ سے ایسے سوال پوچھتا تھا۔ جب کُنگ سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو وہ ہم بچہ پارٹی سے گفتگو کرنے لگ جاتا۔ ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا:

''کیا تم نے سکول پڑھا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا: ''ٹھیک ہے، میں تمھارا امتحان لیتا ہوں۔'' تم نمکین مٹر کیسے لکھو گے؟''

میں نے سوچا'' میں اس بھکاری کو امتحان نہیں دوں گا''۔ لہذا میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے بہت ہی ہمدردی سے کہا:

''تم نہیں لکھ سکتے؟۔ اچھا تو میں تمھیں سکھاتا ہوں۔ تمھیں لکھنا آنا چاہیے اس لیے کہ بعد میں جب تمھاری اپنی دکان ہوگی تو تمھیں حساب کتاب لکھنے میں آسانی ہوگی۔''

مجھے پتہ تھا کہ میں الگ اپنی دکان بہت عرصے تک نہیں بنا پاؤں گا۔ مزید برآں ہمارا مالک کبھی بھی مٹر کا لفظ کھاتے میں نہیں لکھتا۔ اس لیے میں نے سرد مہری سے جواب دیا:''میں نے تم سے استاد بننے کی درخواست کب کی ہے؟۔ مجھے مٹر لکھنا آتا ہے، یہ دیکھو!''

کُنگ بہت خوش ہوا اور اپنے دو بڑھے ہوئے ناخنوں سے کاؤنٹر بجاتے ہوئے اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس نے'' درست ہے، درست ہے!'' کہا۔

''بات یہ ہے کہ اس کو خوبصورت طور پر لکھنے کے چار مختلف طریقے ہیں۔ کیا تمھیں آتے ہیں؟''

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں منہ بگاڑا اور وہاں سے چلا گیا۔ کُنگ نے یہ لفظ

کاؤنٹر پر لکھنے کیلئے اپنی انگلی شراب میں ڈبو دی تھی مگر جب اس نے دیکھا کہ میں بہت لاتعلقی دکھا رہا ہوں تو اس نے گہری سانس لی اور بہت ہی مایوس نظروں سے دیکھنے لگا۔

کبھی کبھی قہقہوں کی آوازیں سن کر پڑوس سے بچے بھی آ جاتے اور کُنگ آئی چی کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی پلیٹ سے بھنے ہوئے مٹر دے دیتا۔ مٹر کھانے کے بعد بھی بچے اس کے گرد منڈلاتے، ان کی آنکھیں اس کی پلیٹ پر ہوتیں۔ وہ پریشان ہو کر پلیٹ کو ہاتھ سے چھپا لیتا اور جھک جھک کر کہتا:'' اب زیادہ نہیں بچا۔ خود میرے لیے بھی کافی نہیں ہیں''۔ وہ دوبارہ اپنی پلیٹ پر نظر ڈالتا، سر ہلاتا اور کہتا'' کافی نہیں ہے، کافی نہیں ہے۔ ایمان سے!'' تب بچے قہقہے لگاتے ہوئے چلے جاتے۔

کُنگ آئی چی شغل کیلئے بہت اچھا تھا۔ لیکن ہم اس کے بغیر بھی ٹھیک تھے۔

وسطِ خزاں والے میلے سے کچھ دن قبل ایک روز شراب خانے کا مالک بڑی محنت سے اپنا کھاتہ ٹھیک کر رہا تھا۔ دیوار سے قرضے کا بورڈ اتارتے ہوئے اس نے اچانک کہا:'' کُنگ آئی چی کافی عرصے سے نہیں آیا۔ اس پہ ابھی تک 19 سکّے واجب الادا ہیں!'' تب مجھے بھی احساس ہوا کہ اسے دیکھے واقعی بہت عرصہ ہو چکا۔

''وہ آئے بھی تو کیسے؟''۔ ایک گاہک بولا'' پچھلی مار میں اس کی ٹانگیں توڑ دی گئیں''۔

''آہ!''

''وہ پھر چوری کر رہا تھا۔ اس بار اس نے یہ حماقت کی کہ صوبائی سکالر مسٹر تنگ کی چوری کی۔ بھلا اس سے بھی کوئی بچ پایا ہے؟''

''پھر کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا؟ پہلے اسے تحریری طور پر اعتراف جرم کرنا پڑا۔ پھر اسے پیٹا گیا۔ مار پیٹ جاری رہی اور بالآخر اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔''

''پھر؟''

''اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں''

''ہاں، مگر اس کے بعد؟''

''اس کے بعد؟........... کیا خبر؟ ہوسکتا ہے وہ مر گیا ہو!''

شراب خانے کا مالک سوال پہ سوال کر رہا تھا مگر ساتھ ساتھ کھانا بھی بناتا جا رہا تھا۔ وسط خزاں کے میلے کے بعد ٹھنڈ روز بروز بڑھتی گئی۔ گو کہ میں اپنا سارا وقت سٹوو کے پاس گزارتا مگر پھر بھی گرم جیکٹ پہنے رہتا۔ ایک سہ پہر جب دکان خالی تھی میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا کہ میں نے ایک آواز سنی:

''شراب کا ایک کٹورا گرم کرو''۔

آواز بہت دھیمی مگر شناسا سی لگی۔ مگر جب میں نے نظریں اٹھائیں تو مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اور دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں چوکھٹ کی طرف منہ کیے، کاؤنٹر کے نیچے کُنگ آئی چی بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ اجاڑ اور لاغر تھا۔ اور اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے ایک پھٹا پرانا کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک چٹائی پہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا جو کہ ایک رسی کے ساتھ اس کے کاندھوں سے بندھی ہوئی تھی۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو دہرایا:

''شراب کا ایک کٹورا گرم کرو''۔

اسی وقت میرا مالک کاؤنٹر کے اوپر سے جھکا اور کہنے لگا: ''کون کُنگ آئی چی؟ تم ابھی تک 19 سکّوں کے مقروض ہو''۔

''وہ.......... میں اگلی بار چکا دوں گا''۔ کُنگ نے رنجیدہ انداز میں اوپر دیکھتے ہوئے جواب دیا: ''اس بار کی رقم نقد لایا ہوں۔ یہ لو۔ شراب اچھی ہونی چاہیے۔''

شراب خانے کا مالک ہمیشہ کی طرح ہنسا اور کہنے لگا: ''کُنگ آئی چی تم نے پھر چوری کی ہے''۔

''تم اپنا مذاق اڑانا جاری رکھو''۔

مگر پرزور احتجاج کرنے کے بجائے اس نے کہا:

''مذاق؟۔ اگر تم نے چوری نہیں کی تو انھوں نے تمھاری ٹانگیں کیوں توڑ دیں؟''

''میں گر گیا تھا'' کُنگ نے نیچی آواز میں کہا۔ ''میں گر گیا اور اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھا''

اس کی آنکھیں شراب خانے کے مالک سے ملتجی لگتی تھیں کہ اس معاملے پر مزید بات نہ کی جائے۔ اس وقت تک کئی لوگ جمع ہو گئے اور وہ سب کے سب ہنس رہے تھے۔ میں نے شراب گرم کی، اس کے پاس لے گیا اور چوکھاٹ پر رکھ دی۔ اس نے اپنے بوسیدہ کوٹ کی جیب سے چار سکے نکالے اور میرے ہاتھ پہ رکھے۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ مٹی سے اٹے ہوتے تھے۔ لگتا تھا وہ یہاں تک پیٹ کے بل چلتا ہوا آیا تھا۔ اس نے شراب ختم کی، اور دوسروں کے تبصروں اور قہقہوں کے بیچ ہاتھوں کے بل گھسٹتا ہوا چلا گیا۔

اس کے بعد ایک عرصے تک کُنگ کی کوئی خبر نہ آئی۔ سال کے آخر میں شراب خانے کے مالک نے بورڈ اتارتے ہوئے کہا: ''کُنگ آئی چی ابھی تک 19 سکوں کا مقروض ہے!'' اگلے برس ڈریگن کشتی میلے پہ اس نے پھر یہی فقرہ کہا۔ مگر جب وسطِ خزاں کا میلہ آیا تو اس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اسے دیکھے بغیر ایک اور سال آیا اور گزر گیا۔ نہ ہی بعد میں میں نے اسے کبھی دیکھا۔ شاید کُنگ آئی چی واقعی مر چکا ہے۔

دوا

1

خزاں کی رات تھی۔ چاند ڈوب چکا تھا مگر سورج نکلنے میں ابھی دیر تھی۔ آسمان پر ایک نیلگوں سی روشنی پھیل رہی تھی۔ چند چمگادڑوں کے سوا بقیہ رات خوابیدہ تھی۔ بوڑھا چوآن بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے بتی جلائی تو چائے خانے کے دو کمروں میں ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ بوڑھی عورت جو شاید پہلے سے جاگ رہی تھی کھانستے ہوئے بولی:

''جانے کی تیاری کر رہے ہو؟''۔ جواب آیا ''ہاں''۔

بوڑھے چوآن نے لباس درست کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا ''لاؤ پیسے دے دو''۔

بیوی نے تکیے کے نیچے ٹٹولتے ہوئے چاندی کے سکوں کی تھیلی اس کے حوالے کر دی۔

بوڑھے چوآن نے تھیلی جیب میں رکھی، دو دفعہ جیب تھپتھپا کر تسلی کر لی۔ اس نے کاغذ کی شمع جلائی، تیل والا لیمپ بجھا دیا اور اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ چیزوں کے ٹٹولنے اور کھانسنے کی آوازیں آئیں۔ جب دوبارہ خامشی چھا گئی تو بوڑھے چوآن نے دھیرے سے آواز دی: ''بیٹا، تم بستر سے نہ اٹھنا۔۔۔تمھاری ماں دکان سنبھال لے گی۔۔۔۔''۔

کوئی جواب نہ پا کر بوڑھا چوآن سمجھ گیا کہ بیٹا دوبارہ گہری نیند سو گیا ہے۔ چنانچہ وہ باہر گلی میں نکل آیا۔ اندھیرے میں سڑک کی لکیر کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لالٹین کی روشنی اس کے بڑھتے پیروں پر پڑتی تھی۔ چوآن کا جذبہ بلند تھا جیسے وہ اچانک پھر سے جوان ہو گیا ہو، اور جیسے اس

کے پاس زندگی بچانے کی کوئی قوت آ گئی ہو۔ اس کے ڈگ لمبے ہوتے گئے۔ سڑک واضح نظر آنے لگی اور آسمان روشن تر ہوتا گیا۔

وہ چلتا رہا۔ اچانک سامنے چوک آ گیا تو وہ چونک گیا۔ رک کر چند قدم پیچھے ہٹا اور ایک بند دکان کے چھجے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اسے سردی محسوس ہونے لگی۔

''ارے بوڑھا آدمی''

''ہمت والا لگتا ہے۔۔۔۔''

بوڑھا چوآن پھر روانہ ہوا۔ اسے کئی راہگیر نظر آئے۔ ان میں سے ایک نے تو مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی، اور اگرچہ وہ اسے واضح طور پر نہ دیکھ سکا مگر اس کی آنکھیں اس طرح روشن ہو گئیں جیسے کہ ایک فاقہ زدہ کی آنکھیں خوراک دیکھ کر چمک اٹھتی ہوں۔ بوڑھے نے دیکھا کہ اُس کی لالٹین بجھ چکی تھی۔ اس نے اپنی جیب تھپتھپائی، سخت تھیلی ابھی تک وہیں تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ اسے عجیب لوگ نظر آئے۔ وہ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ایسے پھر رہے تھے جیسے بھٹکی ہوئی روحیں ہوں۔ اُسے چند سپاہی بھی نظر آئے۔ جن کی وردیوں کے سامنے اور پشت پر بنے بڑے سفید دائرے واضح تھے اور جب وہ قریب آئے تو اسے ان کی وردی پہ موجود سرخ دھاری بھی نمایاں طور پر دکھائی دینے لگی۔ پھر قدم بڑھاتا ہوا ایک ہجوم اُس کے پاس سے گزرا۔ پہلے پہنچنے والے چھوٹے گروہ بھی اکٹھے ہو گئے اور آگے بڑھنے لگے۔ چوک سے ذرا پہلے پہنچ کر وہ یک دم رکے اور ایک نیم دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔

ان لوگوں کی پشت چوآن کی جانب تھی۔ وہ سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی گردنیں مرغابیوں جیسی لگتی تھیں۔ لگتا تھا جیسے کسی نظر نہ آنے والے ہاتھ نے کئی مرغابیاں پکڑ رکھی ہوں۔ لمحہ بھر خاموشی رہی، پھر ایک آواز سنائی دی اور پھر تماشائیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ سب پیچھے ہٹنے لگے اور بوڑھا چوآن ان کے ریلے کے زور سے گرتے گرتے بچا۔

''لاؤ، پیسے دے دو اور اپنا مال لے لو''۔ سیاہ لباس میں ملبوس ایک شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں اور بوڑھا چوآن خوف کے مارے سکڑ کر رہ گیا۔ اس شخص

نے اپنا ایک لحیم شحیم ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جبکہ اس نے دوسرے ہاتھ میں بھاپ اڑاتی ایک روٹی پکڑ رکھی تھی جس سے سرخ سرخ قطرے ٹپک رہے تھے۔

بوڑھے چوآن نے جلدی جلدی ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا اور کانپتے ہوئے اسے پیسے دینے لگا۔لیکن اسے وہ چیز وصول کرنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ وہ شخص بے صبری سے چیخا:'' کس چیز سے خوف کھا رہے ہو؟ کیوں لیتے نہیں؟''۔ بوڑھا چوآن ابھی تک ہچکچا رہا تھا۔ سیاہ پوش شخص نے اس کی لالٹین چھین لی اور اس کی کاغذ کی چمنی پھاڑ دی اور اس میں روٹی لپیٹ دی۔ پیکٹ بنا کے اس نے وہ بوڑھے چوآن کے ہاتھ میں تھما دی۔اسی لمحے اس نے پیسے جھپٹ لئے۔اور یہ کہتا ہوا مڑ گیا۔۔۔''بیوقوف بڈھا۔۔۔''

''یہ کس بیماری کیلئے ہے؟''۔ بوڑھے چوآن نے کسی کو پوچھتے ہوئے سنا۔مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔اس کی ساری توجہ اس پیکٹ کی طرف تھی جسے اس نے اتنی احتیاط سے اٹھایا ہوا تھا جیسے وہ کسی قدیم مکان سے ملا ہوا کوئی خزانہ ہو۔اب گویا کسی اور چیز کی اہمیت رہ ہی نہیں گئی تھی۔ وہ اس نئی زندگی کو خود اپنے گھر میں پیوند کرنے والا تھا اور پھر مسرتوں کی فصل حاصل کرنے والا تھا۔

سورج نکل چکا تھا۔اس کے سامنے سڑک روشن ہو چکی تھی جو سیدھی اس کے گھر جاتی تھی۔

2

جب بوڑھا چوآن گھر پہنچا تو اس وقت تک دکان کی صفائی ہو چکی تھی، اور چائے کی اجلی میزیں قطار میں چمک رہی تھیں، مگر ابھی تک کوئی گاہک نہ آیا تھا۔صرف اس کا بیٹا دیوار کے قریب بیٹھا کھانس رہا تھا۔اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔اس کی دھاری دار جیکٹ اس کے لاغر جسم کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر بوڑھے چوآن کے ماتھے پر فکر سے بل پڑ گئے۔اس کی بیوی باورچی خانے سے اپنی پر امید نظروں اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ تیز چلتے ہوئے اس کے پاس آئی:

''ملی؟''

''ہاں''۔

وہ دونوں باورچی خانے گئے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر بڑھیا باہر نکلی اور کنول کا ایک سوکھا پتا لیے واپس آئی۔اس پتے کو اس نے میز پر بچھا دیا۔ بوڑھے چوآن نے لالٹین کے کاغذ میں سے روٹی نکالی اور اسے کنول کے پتے پر رکھ دیا۔ بیٹا کھانا ختم کر چکا تھا مگر ماں نے جلدی جلدی اس سے کہا:

''ابھی وہیں بیٹھے رہو، یہاں نہ آنا''۔

انگیٹھی میں آگ جلا کر بوڑھے چوآن نے سبز پیکٹ اور لالٹین والا کاغذ دونوں اس میں جھونک دیئے۔ایک سرخی مائل شعلہ لپکا اور دکان میں ایک عجیب بو پھیل گئی۔

''کتنی اچھی خوشبو ہے۔تم لوگ کیا کھا رہے ہو؟''۔ان کا کبڑا گاہک پہنچ گیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کہ سارا سارا دن چائے خانوں میں گزارتے تھے۔ وہ صبح سویرے سب سے پہلے آجاتا اور رات گئے سب سے آخر میں نکل جاتا۔ آج وہ ایک میز پر گلی کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔کسی نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔

''ابلے ہوئے چاول کھا رہے ہو؟''۔

اب بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ بوڑھا چوآن اس کیلئے چائے بنانے فوراً باہر آ گیا۔

''یہاں آؤ بیٹے''۔ماں نے بیٹے کو اندر بلا لیا۔اس نے کمرے کے درمیان میں ایک سٹول رکھ دیا اور بچے کو اس پر بٹھا دیا۔ پھر وہ اس کیلئے پلیٹ میں ایک سیاہ گول شئے لائی اور کہنے لگی:

''اسے کھا لو۔۔۔اس سے تم صحت یاب ہو جاؤ گے''۔

بچے نے کالی چیز اٹھا لی اور اسے دیکھنے لگا۔اسے ایک عجیب سا احساس ہونے لگا۔ گویا اس نے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں میں تھامی ہوئی ہو۔اس نے اسے کھولا۔ اس کے اندر سے سفید رنگ کے بخارات بھری بھاپ نکلی۔ ذائقے کو نظر انداز کرتے ہوئے بچے نے ساری کی ساری روٹی کھا لی۔بس سامنے خالی پلیٹ رہ گئی تھی۔اس کے ماں باپ دونوں اس کے پاس کھڑے تھے۔اس کی آنکھیں جیسے بہ یک وقت کچھ انڈیل رہی ہوں اور کچھ نکال باہر کر رہی ہوں۔اس کا چھوٹا سا دل

تیزی سے دھڑ کنے لگا۔اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور وہ دوبارہ کھانسنے لگا۔

ماں نے کہا: ''بیٹے ذرا سا سو جاؤ، ٹھیک ہو جاؤ گے''۔

بیٹے نے اطاعت کی اور کھانستے کھانستے سو گیا۔ ماں اس وقت تک وہیں کھڑی رہی جب تک کہ بچے کی سانسیں معمول کے مطابق ہو گئیں۔تب اس نے اس پہ ایک پیوند لگی رضائی ڈال دی۔

3

دکان میں بھیڑ تھی۔اور بوڑھا چوآن بڑی سی کیتلی میں ایک کے بعد دوسرے گاہک کو چائے دینے میں مصروف تھا۔اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔

''تم ٹھیک تو ہو، بوڑھے چوآن؟۔۔۔کیا پریشانی ہے؟''۔ایک سفید ریش نے پوچھا۔

''کچھ نہیں''۔

''کچھ نہیں؟۔۔۔نہیں نہیں، مجھے تمہاری مسکراہٹ سے اندازہ ہو رہا ہے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے''۔

''بات صرف یہ ہے کہ بوڑھا چوآن مصروف ہے''۔ کبڑے گاہک نے کہا۔''اگر اس کا بیٹا...... '' مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کر لیتا ایک موٹا بے ڈھنگا شخص دھڑام سے اندر داخل ہوا۔اس نے گہرے بھورے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔بٹن کھلے ہوئے تھے۔داخل ہوتے ہی وہ بوڑھے چوآن پر چیخا۔

''بچے نے وہ کھالی؟۔ کچھ افاقہ ہوا؟۔تمہاری قسمت بہت اچھی ہے بوڑھے چوآن!''۔''تم خوش قسمت ہو کہ میں نے تمہارا کام جلدی کروادیا''۔

بوڑھا چوآن ایک ہاتھ میں کیتلی تھامے ہوئے تھا۔وہ دوسرے ہاتھ سے اس کی تکریم میں کورنش بجا لایا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔باقی لوگ بھی احترام سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔بوڑھی عورت چائے کا خالی پیالہ لئے باہر آئی۔اس نے اس پیالے میں زیتون کا ایک

پتہ ڈالا اور بوڑھے چوآن نے اس کے اندر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا۔بڑھیا کی آنکھوں کے گرد بھی سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔

وہ موٹا بھدا شخص بولا: ''یہ شرطیہ علاج ہے، عام دوا نہیں ہے یہ۔بس اسے گرم گرم کھانا شرط ہے!''۔

''ہاں، بلاشک، کانگ چچا ہم آپ کی مدد کے بغیر اسے حاصل نہ کر سکتے تھے''۔ بڑھیا نے گرمجوشی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''شرطیہ علاج ہے، بس گرم گرم کھاؤ، انسانی خون میں ڈبوئی ہوئی روٹی ٹی بی کا شرطیہ علاج ہوتی ہے''۔

''ٹی بی'' کے نام سے بڑھیا کی طبیعت کچھ مکدر ہوئی، وہ ذرا سی پیلی پڑ گئی۔مگر پھر جبراً خود پر مسکراہٹ طاری کر دی۔اور کسی بہانے وہاں سے چلی گئی۔اس دوران وہ موٹا شخص بلند ترین آواز میں بولتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ اندر کے کمرے میں بچہ جاگ گیا اور کھانسنے لگ گیا۔

''بھئی تم بہت خوش قسمت ہو، تمہیں بچے کے لئے دوا مل گئی۔وہ یقینی طور پر پوری طرح تندرست ہو جائے گا''۔

بوڑھا چوآن مسکرا رہا تھا۔

اس دوران سفید ریش آدمی موٹے بھدے باتونی شخص کے پاس آیا اور دھیمی آواز سے پوچھا:

''مسٹر کانگ!، میں نے سنا ہے کہ آج سزائے موت پانے والا ''سیا'' خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔وہ کون تھا؟ اور اسے سزائے موت کیوں ہوئی؟''۔

''وہ بیوہ 'سیا' کا بیٹا تھا، بدمعاش!''۔

جب اس نے دیکھا کہ سارے لوگ بہت توجہ سے اس کی بات سن رہے ہیں تو وہ اور پھول گیا اور مزے لے لے کر اپنی بلند ترین آواز میں کہتا رہا:

''وہ غنڈہ تو زندہ رہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔اس بار اس کی موت سے مجھے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا

۔حتیٰ کہ اس کے کپڑے بھی سرخ آنکھوں والا جیلر لے گیا۔ ہمارا بوڑھا چوآن سب سے زیادہ خوش قسمت نکلا۔ انعام کی ساری رقم یعنی 25 چاندی کے سکے اس کی جیب میں گئے۔ اسے تو بیٹے کے علاج کیلئے جیب سے ایک دھیلا بھی خرچ نہیں کرنا پڑا''۔

بچہ کھانستا ہوا آہستہ آہستہ باہر آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سینے کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ باورچی خانے میں چلا گیا، ٹھنڈے چاول کا ایک پیالہ بھرا اور اس پر گرم پانی ڈال دیا اور بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس کی ماں اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا:

''بیٹا، کچھ افاقہ محسوس کرتے ہو، یا ابھی بھی ہمیشہ کی طرح بھوکے ہو؟''

''شرطیہ علاج!'' کانگ نے بچے کی طرف دیکھا اور پھر بیٹھے ہوئے لوگوں کو متوجہ کیا۔

''بوڑھا چوآن واقعی چالاک شخص ہے۔ اگر وہ مخبری نہ کرتا تو خود اس کا اپنا خاندان سزائے موت پاتا اور اس کی جائیداد بھی ضبط ہو جاتی۔ اب دیکھو، الٹا انعام میں چاندی حاصل کی۔ وہ بدمعاش تو واقعی کمینہ تھا۔ اس نے تو جیلر کو بھی بغاوت کرنے پر اکسانے کی کوشش کی''۔

بچے نے چاول ختم کیے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس پہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کانگ اس کے پاس گیا، اس کے کندھے تھپتھپائے، اور کہا:

''شرطیہ علاج۔ اس طرح نہ کھانسو بچے۔ شرطیہ علاج''۔

4

فصیل کے مغربی گیٹ سے باہر کی زمین مشترکہ تھی۔ اس میں سے شارٹ کٹ کی تلاش میں پیدل آنے جانے والے لوگوں کے پیروں سے بنا راستہ ایک طرح سے ایک قدرتی سرحد بن گیا تھا۔ اس راستہ کے بائیں جانب سزائے موت پانے والے مجرم دفن تھے یا وہ لوگ جو کہ جیل میں نظر اندازی کی وجہ سے مر چکے تھے۔ راستے کی دائیں جانب عام غریبوں کی قبریں تھیں۔

اس سال جشنِ چِنگ منگ کے موقع پر غیر معمولی سردی تھی۔ درختوں کی شاخیں ابھی

ابھی پھوٹ رہی تھیں۔ دن نکلتے ہی بوڑھے چوآن کی بیوی چار ڈشیں اور چاول کا ایک پیالہ دائیں طرف ایک نئی قبر کے پاس لائی۔ اور اس پر ماتم کرنے لگی۔ جب اس نے کاغذی رقم جلالی تو وہیں زمین پر بیٹھ گئی، جیسے کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو۔ مگر کس چیز کے لئے؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے چھوٹے بال بکھیر کے رکھ دیئے جو کہ پچھلے سال کی بہ نسبت زیادہ سفید ہو چکے تھے۔

ایک اور عورت بھی راستہ چلتے آتی نظر آئی۔ اس کے بال سفید تھے اور اس کا لباس بہت خستہ تھا۔ اس نے ایک پرانی، گول سرخ رنگ کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی جس پر کاغذی رقم لٹکی ہوئی تھی۔ وہ رک رک کر چل رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ بوڑھے چوآن کی بیوی زمین پر بیٹھی اُسے دیکھ رہی ہے تو وہ جھجکی، اور اس کے پیلے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑی۔ لیکن اس نے جرات سے کام لیا اور بائیں جانب کے قبرستان کی ایک قبر کے پاس گئی۔ وہ قبر بوڑھے چوآن کے بچے کی قبر کے بالکل مقابل تھی، صرف راستہ درمیان میں تھا۔ بوڑھے چوآن کی بیوی نے جب دیکھا کہ اس عورت نے خوراک کی چار ڈشیں اور چاول کا پیالہ رکھا، پھر ماتم کرنے کھڑی ہو گئی، تو اس نے سوچا: ''اس قبر میں اس کا بھی بیٹا ہو گا''۔ بوڑھی عورت بلا مقصد ایک دو قدم چلی اور پھر اچانک کپکپانے لگی۔ وہ سر چکرانے کی طرح ڈگمگانے لگی۔ بوڑھے چوآن کی بیوی ڈر گئی کہ کہیں غم سے وہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔ وہ اٹھی، راستہ پار کیا اور اس کے پاس جا کر بولی: ''بس کرو، چپ ہو جاؤ، چلو گھر چلتے ہیں''۔

دوسری نے اثبات میں سر ہلایا مگر وہ ابھی تک ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑبڑائی: ''دیکھو، وہ کیا ہے؟''۔

بوڑھے چوآن کی بیوی نے اس طرف دیکھا تو اُسے نظر آیا کہ اس کے سامنے کی قبر پہ ابھی تک گھاس بھی نہ اگی تھی۔ مگر جب اس نے غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ قبر کے اوپر سرخ و سفید پھولوں کا ہار رکھا ہوا تھا۔

دونوں کی نظر کمزور تھی پھر بھی وہ سفید و سرخ پھولوں کے ہار کو واضح طور پر دیکھ رہی تھیں۔ وہ پھول تعداد میں زیادہ تو نہ تھے مگر وہ ایک دائرے میں رکھے گئے تھے، اور گو کہ زیادہ تازہ نہ تھے مگر

سلیقے سے رکھے گئے تھے۔ بوڑھے چوآن کی بیوی نے مڑ کر اپنے بیٹے کی قبر دیکھی تو اس پر دوسری قبروں کی طرح چند پیلے پھول ہوا میں لرزتے ہوئے نظر آئے۔ کہیں کسی قبر پر بھی پھولوں کی کوئی چادر نہ تھی۔ اچانک اسے سب کچھ فضول لگا اور اسے پھولوں کی چادر پر تعجب نہ ہوا۔

اسی دوران بوڑھی عورت ان پھولوں کے ہار کو قریب سے دیکھنے چلی گئی۔ ''ان کی جڑیں نہیں ہیں''۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''وہ اگے ہوئے نہیں ہیں۔ تو پھر انھیں یہاں کون لایا تھا؟ ۔ بچے یہاں پر کھیلنے آتے نہیں۔ ہمارے رشتہ داروں میں کبھی کوئی ادھر نہیں آتا۔ تو؟''۔ وہ اس پر پریشان ہوئی۔ اور پھر اچانک اس کے آنسو رواں ہو گئے اور وہ زور سے چیخنے لگی:

''بیٹے ان سب نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، تمھیں غلط سمجھا ہے۔ اور تم یہ کبھی نہ بھولنا۔ کیا تمہارا صدمہ ابھی تک اتنا بڑا ہے کہ تم نے آج مجھے بتانے کے لئے یہ حیران کن کام کیا؟''۔

اس نے ہر طرف نگاہ دوڑائی مگر اسے صرف ایک کوّا نظر آیا جو بے برگ شاخ پر بیٹھا تھا۔

''میں جانتی ہوں'' وہ بولتی گئی۔ ''انہوں نے تمہیں بے گناہ قتل کر دیا۔ مگر حساب کتاب کا ایک دن آئے گا۔ آسمان خود فیصلہ کرے گا۔ سکون سے اپنی آنکھیں بند کر لو۔۔۔ اگر تم واقعی یہاں ہو اور میری آواز سن سکتے ہو تو اپنی بے گناہی کی نشانی کے بطور اس کوّے کو اس قبرستان سے اڑا دو''۔

ہوا بہت پہلے تھم چکی تھی اور سوکھی گھاس سیدھی کھڑی تھی۔ ایک ہلکی مرتعش آواز فضا میں ابھری، پھر مدھم ہوتی ہوئی ختم ہو گئی۔ سارا علاقہ موت کی طرح خاموش تھا۔ وہ دونوں سوکھی گھاس میں کھڑے کوّے کو دیکھتی رہیں، اور کوّا درخت کی سخت شاخ پہ سر چھپائے فولاد کی طرح بلا حرکت بیٹھا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ اور لوگ، پیر و جواں اپنے عزیزوں کی قبروں پہ آنے جانے لگے۔ کوّا جب نہ اڑا تو بوڑھی چوآن کی بیوی کو یوں لگا جیسے اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ اسے جانے کی خواہش ہوئی، دوسری سے کہنے لگی:

''آؤ چلیں''۔

بوڑھی عورت نے آہ بھری۔ اور بغیر کسی تاثر کے برتن اٹھا لیے۔ ایک لمحے کی جھجک کے

بعد وہ آہستہ آہستہ روانہ ہو گئی۔ وہ ابھی تک خود سے بڑبڑا رہی تھی:

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

وہ تیس قدم جا چکی ہوں گی کہ انہیں اپنی پشت پر کائیں کائیں کی اونچی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا تو کوے نے اپنے پر پھیلا دیئے، اڑنے کے لئے جھٹکا کھایا اور پھر ایک تیر کی طرح دور افق کی طرف اڑ گیا۔

آنے والا کل

''ایک بھی آواز نہیں............ بچے کو کیا ہوا؟''

زرد شراب کا پیالہ ہاتھ میں لیے سرخ ناک والے گنگ نے یہ کہتے ہوئے اگلے گھر کی طرف سر کو جھٹکا دیا۔ نیلی کھال والے آہ وو نے اپنا پیالہ نیچے رکھا اور دوسرا بھر لیا۔

''آہ''۔ اس نے بھاری آواز میں کہا ''پھر جذباتی ہو رہا ہوں!''

بہت دور دراز واقع ہونے کی وجہ سے لوچن نسبتاً پرانی فیشن کا تھا۔ لوگ گھڑیال کی پہلی آواز سے پہلے اپنے دروازے بند کر لیتے اور سونے چلے جاتے۔ نیم شب تک صرف دو مکان جاگتے رہتے۔ شراب خانہ جہاں چند شرابی شراب پر پیسہ اڑاتے تھے، اور ساتھ والا گھر جہاں چوتھے شان کی بیوی رہتی تھی۔ وہ دو سال قبل بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کے پاس ایک کپاس کاتنے کے چرخے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا جس پر وہ کپاس سے دھاگہ بنا کے اپنا اور اپنے تین سالہ بیٹے کا گزارہ کرتی تھی۔ اسی لیے وہ بھی دیر سے سوتی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ کئی دن سے کپاس کاتنے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لیکن چونکہ دو ہی مکان آدھی رات تک جاگتے تھے اس لئے جب چوتھے شان کی بیوی کے گھر سے کوئی آواز آتی تو بھی فطری طور پر بوڑھا گنگ اور دیگر ہی سن سکتے تھے۔ اور اسی طرح انہی کو معلوم ہو سکتا تھا کہ وہاں سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔

ٹُن ہونے کے بعد بوڑھے گنگ نے ایک فوک گیت گانا شروع کیا۔

اسی دوران چوتھے شان کی بیوی اپنے بستر کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ پاؤ ارھ............ اس کا لال، اس کے بازوؤں میں تھا اور اس کا چرخا فرش پر خاموش کھڑا تھا۔ لیمپ کی روشنی پاؤ ارھ کے چہرے پر پڑتی تھی جو کہ ایک بخار والی سرخی میں دھکتا نظر آتا تھا۔

''میں نے عبادت گاہ کے سامنے بہت سجدے کئے''، وہ سوچ رہی تھی۔ ''میں نے دیوتاؤں سے قربانی کا عہد کیا۔ اگر اب بھی وہ صحت یاب نہیں ہوتا تو میں کیا کر سکتی ہوں؟۔ میں اسے ڈاکٹر ہو سیاؤ سین کے پاس لے جاؤں گی۔ مگر ممکن ہے پیاؤ ارھ کی حالت صرف رات کو ابتر ہوتی ہو۔ اور جب کل سورج نکلے تو ہو سکتا ہے اس کا بخار چلا جائے اور وہ دوبارہ آرام سے سانسیں لے لے۔ بہت سی بیماریاں اس طرح ہوتی ہیں''۔

چوتھے شان کی بیوی ایک سادہ عورت تھی۔ وہ نہیں جانتی کہ ''لیکن'' کا لفظ کس قدر وہشتناک ہوتا ہے۔ اسی ''لیکن'' کی برکت سے کئی بُری چیزیں بہتر ہو جاتی ہیں، کئی اچھی چیزیں بُری بن جاتی ہیں۔

گرمیوں کی رات مختصر ہوتی ہے۔ جونہی بوڑھے گنگ اور دوسروں نے گانا بند کر دیا آسمان مشرق سے چمکنے لگا اور جلد ہی کھڑکی کی درزیں صبح صادق کی روپہلی روشنی چھان کر اندر بھیج رہی تھیں۔

صبح ہونے کا انتظار چوتھے شان کی بیوی کے لئے اتنا سادہ معاملہ نہ تھا جتنا کہ دوسروں کے لئے تھا۔ وقت بہت سست رفتاری سے گھسٹ رہا تھا۔ لگتا تھا پاؤ ارھ کی ہر سانس ایک سال تک چلے گی۔ مگر اب بالآخر صبح ہو گئی تھی۔ صاف شفاف دن کی روشنی لیمپ کی روشنی کو نگل گئی تھی۔ پاؤ ارھ نے جب سانس کے لیے ہوا کھینچی تو اُس کے نتھنے لرز اٹھے۔

چوتھے شان کی بیوی کی چیخ نکلی اس لئے کہ اُسے معلوم تھا یہ بیماری کی انتہا ہے۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟۔ وہ حیران تھی۔ واحد امید یہ تھی کہ اسے ڈاکٹر ہو کے پاس لے جایا جائے۔ وہ سادہ عورت تو ہو گی مگر وہ ارادے کی بہت پکی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی، الماری تک گئی اور اپنی ساری پونجی اٹھا لی۔ اسے جیب میں رکھا، دروازے پر تالا لگایا اور جتنا ممکن تھا تیز رفتاری سے پاؤ ارھ کو ڈاکٹر ہو

کے گھر کی طرف لے گئی۔

گو کہ ابھی بہت سویر تھی مگر وہاں پہلے ہی چار مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے 40 سکے رجسٹریشن سلپ کے لئے دے دیے اور اس طرح پاؤ ارھ پانچواں مریض بنا۔ ڈاکٹر ہو نے بچے کی نبض دیکھنے کے لئے دو انگلیاں پھیلائیں۔ چوتھے شان کی بیوی دل میں سوچ رہی تھی ''یقیناً میرا پاؤ ارھ زندہ رہے گا''۔ مگر وہ بہ یک وقت بے چین بھی تھی اور ہیجانی انداز میں خود کو پوچھنے سے نہ روک سکی:

''آنت بند ہو گئی ہے''۔

''کیا یہ خطرناک بیماری ہے؟ کیا وہ............؟''

''شروع تو اِن دو دوائیوں سے کرو''

''وہ سانس نہیں لے سکتا۔ اس کے نتھنے جھٹکے کھاتے ہیں''۔

''آگ کا عنصر دھات کے عنصر پر قابو پاتا ہے............'' (یعنی دل کی تکلیف نے پھیپھڑوں کو متاثر کیا ہے)

اپنا فقرہ نامکمل چھوڑ کر ڈاکٹر ہو نے آنکھیں بند کیں، اور چوتھے شان کی بیوی نے مزید کچھ نہ کہنا چاہا۔ ڈاکٹر کے سامنے تیس برس کا ایک اور شخص بیٹھا تھا جس نے نسخہ لکھ لیا۔

''یہ پہلی دوا بچے کو بچانے کی ہے''۔ اس نے اسے بتایا۔ ''یہ تمہیں صرف چن خاندان کی دکان پر ملے گی''۔

چوتھے شان کی بیوی نے کاغذ اٹھا لیا اور جاتے ہوئے سوچنے لگی۔ وہ سادہ عورت تو ہو گی مگر وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر ہو کا گھر، چن خاندان کی دکان اور اُس کا اپنا گھر ایک تکون بناتے ہیں، اس لئے بلاشبہ پہلے دوائی خریدنی ہے اور پھر واپس جانا ہے۔ وہ جس قدر تیز چل سکتی تھی، اُس تیزی سے دکان تک گئی۔ دکاندار نے احتیاط سے نسخہ پڑھا اور دوائی پیک کرنے لگا۔ پاؤ ارھ کو بانہوں میں رکھے چوتھے شان کی بیوی انتظار کرتی رہی۔ اچانک پاؤ ارھ نے ایک میں ہاتھ ذرا کچھاؤ پیدا کیا اور اپنا بالوں کا ڈھیلا گچھا سختی سے پکڑ لیا۔ اس نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا، اور ماں دہشت زدہ ہو گئی۔

سورج اب اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ بچہ بازوؤں میں اور ہاتھ میں دوائی کا پیکٹ لیے وہ جتنا چلتی جاتی وزن بڑھتا لگتا۔ بچہ بھی ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا جس نے راستے کو مزید لمبا بنا دیا تھا۔ اسے راستے میں ایک بڑے گھر کے دروازے پر کچھ دیر ستانے کے لئے بیٹھنا پڑا۔ اسے اندازہ ہوا کہ پسینے سے اس کے کپڑے بھیگ چکے ہیں۔ مگر پاؤ ارھ گہری نیند میں لگتا تھا۔ جب وہ دوبارہ چلنے کے لئے اٹھی تو اسے پھر لگا کہ بچہ بہت بھاری ہے۔ اس کے قریب سے آواز آئی:

''چوتھے شان کی بیوی، لاؤ میں اٹھاتا ہوں'' یہ نیلی کھال والے آہ وو کی آواز تھی۔ جس کی آنکھیں نیند سے اب بھی بوجھل تھیں۔

گو کہ چوتھے شان کی بیوی سخت منتظر رہی تھی کہ کوئی فرشتہ اس کی مدد کو آئے، مگر وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ فرشتہ آہ وو ہو۔ مگر آہ وو تو ضدی تھا، اس لئے کہ اس نے اس کی مدد کرنے پر سخت اصرار کیا، اور بالآخر، کئی بار انکار کے بعد وہ ہار مان گئی۔ جب اُس نے اپنے بازو اس کے سینے اور بچے کے درمیان پھیلائے، اور ہاتھ نیچے کر کے پاؤ ارھ کو سنبھالا تو چوتھے شان کی بیوی نے سینے کے ساتھ ساتھ گرمی کی ایک لہر محسوس کی۔ وہ کانوں تک سرخ ہو گئی۔

وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے، ڈھائی فٹ کے فاصلے سے۔ آہ وو نے کچھ جملے کہے جن کا چوتھے شان کی بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ابھی دور نہ گئے تھے کہ اس نے بچہ یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ اسے ایک دوست کے پاس کھانے پہ جانا ہے۔ چوتھے شان کی بیوی نے بچہ واپس لے لیا۔ خوش قسمتی سے اب فاصلہ کم رہ گیا تھا اور دور سے اُسے گلی کے نکڑ پر بیٹھی نویں چچی وانگ نظر آئی۔ اس نے آواز دی:

''چوتھے شان کی بیوی، بچے کا کیا حال ہے۔ کیا تم نے ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟''

''ہاں نویں چچی وانگ۔ آپ تو تجربے کار ہیں۔ آپ ذرا اُسے دیکھیں اور بتائیں یہ کیسا ہے؟''

''اچھا۔۔۔''

جب نویں چچی وانگ نے پاؤ ارھ کا معائنہ کیا تو اس نے دوبار سر کو اثبات میں ہلایا اور

پھر دو دفعہ انکار میں۔

جب تک پاؤ ارھ نے دوالی تو دوپہر ہو چکا تھا۔ چوتھے شان کی بیوی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھا خاصا پرسکون لگ رہا تھا۔ عصر کے وقت اس نے اچانک آنکھیں کھولیں اور پکارا ''ماں!''۔ پھر اس نے آنکھیں دوبارہ بند کیں اور لگتا تھا جیسے سو رہا ہو۔ ابھی اسے سوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کے ماتھے اور ناک پر پسینے کے قطرے نظر آئے۔ اور ماں نے ہاتھ لگایا تو یہ پسینہ گوند کی طرح اس کی انگلیوں سے چپک گیا۔ لرزہ میں اس نے اس کے سینے کا معائنہ کیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

اس کی سانس مکمل طور پر رک چکی تھی۔ ہچکیوں کے بعد اس نے زور سے ماتم کرنا شروع کیا۔ جلد ہی لوگوں کے گروہ اکٹھے ہونے لگے۔ کمرے کے اندر نویں چچی وانگ، نیلی جلد والا آہ وو اور دیگر، باہر شراب خانہ کے مالک اور سرخ ناک والا کانگ۔ نویں چچی وانگ نے فیصلہ سنایا کہ کاغذی نوٹ کا ایک فیتہ بنا کر جلایا جائے۔ پھر اس نے دو کرسیاں اور کپڑوں کے پانچ ٹکڑے ضمانت پر لے کر چوتھے شان کی بیوی کو دوڈالر قرض دیے تاکہ اُن سب کے لئے کھانے کا بندوبست ہو جو مدد کر رہے ہیں۔

پہلا مسئلہ تابوت کا تھا۔ چوتھے شان کی بیوی کے پاس چاندی کی بالیوں کا ایک جوڑا بچا تھا جو اس نے شراب خانہ کے مالک کو دیا تاکہ وہ نیم نقد نیم قرض پر تابوت خرید لائے۔ نیلی جلد والے آہ وو نے ہاتھ کھڑا کر کے مدد کے لئے اپنی رضامندی دکھائی مگر نویں چچی وانگ نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس نے اسے صرف یہ کرنے دیا کہ وہ اگلے دن تابوت لے جائے۔ ''بوڑھی کتیا'' اس نے دل میں اسے گالی دی۔ شراب خانے کا مالک واپس آیا اور بتایا کہ یہ تابوت کل صبح تک تیار ہو سکے گی۔

باقی مددگار کھانا کھا چکے تھے۔ اور لوچن پرانے طرز کا تھا اس لئے وہ سب گھڑیال کی پہلی آواز پر سو گئے۔ صرف آہ وو شراب خانے میں شراب پی رہا تھا اور بوڑھا گُنگ ایک گانا غرّا رہا تھا۔

اس دوران چوتھے شان کی بیوی چارپائی کے کونے پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ پاؤ ارھ بستر پر

رکھا ہوا تھا اور چرخا فرش پر کھڑا تھا۔ بہت وقت بعد چوتھے شان کی بیوی کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں اور حیرت سے آس پاس نظر دوڑائی۔ یہ سب ناممکن تھا! ''یہ محض ایک خواب ہے'' اس نے سوچا ''یہ سب ایک خواب ہے۔ میں کل صبح جاگوں گی تو بستر میں لیٹی ہوں گی اور پاؤ ارتھ میرے پہلو میں گہری نیند سویا ہوگا۔ پھر وہ جاگ جائے گا اور پکارے گا ''ماں'' اور کھیلنے کو ایک کمسن شیر کی طرح اچھل کر نیچے اترے گا''۔

بوڑھا گُنگ بہت وقت ہوا گانا ختم کر چکا تھا اور شراب خانے کی بتیاں بجھ چکی تھیں۔ چوتھے شان کی بیوی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا۔ ایک مرغے کی اذان کی آواز آئی، آسمان مشرق کی طرف روشن ہوتا گیا اور کھڑکی کی درزیں صبح کی روشنی کو چھان کر کے اندر لا رہی تھیں۔

درجہ بدرجہ صبح کی روشنی بڑھتی گئی اور سورج افق پر چمک رہا تھا۔ چوتھے شان کی بیوی کھلی آنکھوں کے ساتھ بیٹھی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، تب وہ دروازہ کھولنے گئی۔ ایک اجنبی نے کندھے پر ایک چیز اٹھا رکھی تھی اور اس کے پیچھے نویں چچی وانگ کھڑی تھی۔

آہ، یہ تو تابوت تو جو وہ لایا۔

اس شام تک کہیں جا کر تابوت کا ڈھکنا بند ہو سکا تھا اس لئے کہ چوتھے شان کی بیوی روتی رہی، اور جب بھی تابوت کا ڈھکن بند ہوتے دیکھتی تو اور چیخ مار کر رونے لگتی۔ خوش قسمتی سے نویں چچی وانگ انتظار کرتے کرتے تھک گئی، اٹھی، اُسے گھسیٹ کر ایک طرف کر لیا اور لوگوں نے جلدی جلدی تابوت بند کر دیا۔

چوتھے شان کی بیوی سے جو کچھ ہو سکا تھا اس نے پاؤ ارھ کے لئے کیا تھا۔ گذشتہ روز اس نے اس کے لئے کرنسی نوٹوں کا ایک فیتہ جلایا تھا، آج صبح اس نے بدھ مت کے ذکر کی 49 کتابیں جلائی تھیں، اور تابوت میں ڈالنے سے قبل اسے نیا نویلا لباس پہنایا تھا اور اس کے سرہانے کے ساتھ اس کے پسندیدہ ترین کھلونے رکھ دیئے جن میں مٹی کا ایک بُت، دو لکڑی کے پیالے، دو شیشے کی بوتلیں تھیں۔ گو کہ نویں چچی وانگ احتیاط سے اپنی انگلیوں پر گن رہی تھی، مگر وہ بھی کوئی ایسی

چیز نہ بتاسکی جو وہ کرنا بھول چکی ہوں۔

چونکہ نیلی جلد والے آہ وو نے سارا دن شکل نہ دکھائی، شراب خانہ کے مالک نے چوتھے شان کی بیوی کی طرف سے قبر کھودنے اور تابوت وہاں تک لے جانے کے لئے 210 سکّوں کے عوض دو مزدور کر لئے۔ نویں چچی وانگ نے ہر اُس شخص کے لئے کھانے کا انتظام کرنے میں اس کی مدد کی جس نے ایک انگلی تک مدد کے لئے ہلائی ہو۔ جلد ہی سورج نے اعلان کیا کہ وہ ڈوبنے کو ہے، اور مہمانوں نے واضح کر دیا کہ وہ واپس جانے والے ہیں ۔۔۔۔۔ وہ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

چوتھے شان کی بیوی کا پہلے تو سر چکرایا، مگر کچھ آرام کے بعد وہ ذرا سا بہتر ہوئی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ چیزیں عجیب ہو گئی تھیں۔ ایک ایسی چیز جو اس کے ساتھ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور جو اس کا خیال تھا کہ کبھی واقع نہ ہوگا، ہو چکا تھا۔ وہ جتنا زیادہ سوچتی اتنا زیادہ حیران ہوتی جاتی۔ اور دوسری چیز جو اُسے عجیب لگی وہ یہ تھی کہ کمرہ اچانک بہت خاموش ہو چکا تھا۔

جب وہ اٹھی اور لیمپ جلایا تو کمرہ مزید خاموش ہو گیا۔ وہ ڈگمگاتے ہوئی گئی، دروازہ بند کیا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چرخا فرش پر خاموش رکھا تھا۔ اس نے حواس مجتمع کرنے شروع کیے مگر وہ نہ تو بیٹھ سکتی تھی اور نہ کھڑی ہو سکتی تھی۔ کمرہ محض بہت خاموش نہ تھا، وہ بہت وسیع بھی ہو گیا تھا اور اس میں موجود چیزیں بہت خالی تھیں۔ یہ بہت زیادہ وسیع کمرہ اُسے ایذا دے رہا تھا، اور چاروں طرف خالی پن اس پہ بھاری گزر رہا تھا، وہ مشکل سے سانس لے پا رہی تھی۔

وہ اب جانتی تھی کہ اس کا پاؤ ارہ واقعی مر گیا ہے، اور وہ اس کمرے کو دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے پھونک مار کر لیمپ کو بجھا دیا اور رونے اور سوچنے کے لئے لیٹ گئی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ چرخا کاتتی تھی تو کس طرح پاؤ ارہ مُنگ پھلیاں کھاتے ہوئے اس کے پاس بیٹھتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی کالی آنکھوں سے غور سے ماں کو دیکھتا تھا اور غور کرتا تھا۔ ''ماں'' وہ اچانک پکارتا ''والد نے ریڑھی بیچ دی؛ جب میں بڑا ہوں گا تو میں بھی ریڑھی لگاؤں گا اور بہت سارا پیسہ کماؤں گا ۔۔۔۔ اور یہ سارا تمہیں دے دوں گا''۔

ایسے وقتوں میں اس کے کاتے ہوئے دھاگے کا ایک ایک انچ قیمتی اور زندہ لگتا تھا۔ اب اور کیا سوچ سکتی تھی؟ وہ تو صرف یہ جانتی تھی کہ یہ کمرہ بہت زیادہ خاموش ہے، بہت زیادہ بڑا ہے اور بہت زیادہ خالی ہے۔

گو کہ چوتھے شان کی بیوی ایک سادہ عورت تھی، مگر اتنا ضرور جانتی تھی کہ مُردے دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے، اور اب وہ دوبارہ اپنے پاؤ ارہ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ اس نے گہری آہ بھری اور کہا'' پاؤ ارہ، تم ابھی بھی یہیں کہیں ہو گے۔ تم میرے خواب میں آ جاؤ''۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس امید میں کہ فوراً سو جائے گی تا کہ پاؤ ارہ کو خواب میں دیکھ سکے۔ اس نے اپنی سخت سانس کی آواز واضح سنی ۔۔۔ خاموشی میں، وسعت میں، خالی پن میں۔

بالآخر چوتھے شان کی بیوی پر نیند غالب آ رہی تھی اور سارا کمرہ بہت خاموش تھا۔ سرخ ناک والے گُنگ کا لوک گیت بہت وقت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ شراب خانے سے باہر ڈگمگاتا ہوا ایک لوک گیت بڑبڑا رہا تھا:

''میں تم پر ترس کھاتا ہوں .... میری محبوبہ .... تن تنہا ....''

نیلی کھال والا آہ وو، بوڑھا گُنگ اور دوسرے جا چکے تھے۔ شراب خانے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ لوچن مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف رات، صبح میں بدلنے کو بے تاب خاموشی میں سفر کر رہی تھی ۔۔۔ اور، تاریکی میں چھپے کچھ کتے بھونک رہے تھے۔

حادثہ

مجھے دیہات سے دارالحکومت آئے چھ برس ہو چکے ہیں۔اس دوران میں نے نام نہاد ریاستی معاملات کے بارے میں بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سنا۔مگر کسی چیز نے بھی مجھ پہ بہت زیادہ اثر نہیں ڈالا۔اگر ان اثرات کا پوچھا جائے تو میں محض یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے میرا چڑ چڑا پن بڑھا دیا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ غیر انسانی بنا ڈالا۔

البتہ ایک واقعہ مجھے اہم لگا اور جس نے مجھے اپنے چڑ چڑے پن سے بلند کر دیا،اس حد تک کہ میں اب اُسے بھول نہیں سکتا۔

یہ واقعہ 1917 کی سردیوں میں پیش آیا۔تلخ سرد شمالی ہوائیں چل رہی تھیں۔مگر اپنا گزارہ کرنے کے لئے مجھے صبح سویرے کام کرنے باہر جانا پڑتا تھا۔مجھے سڑک پر ایک بھی ذی روح نہ ملتا اور ''ایس'' گیٹ تک جانے کے لئے رکشہ ڈھونڈنے میں بہت مشکل پیش آتی۔اُس وقت ہوا چلنی کچھ کم ہو گئی تھی۔اس وقت تک ساری ڈھیلی مٹی کو ہوا اڑا کر لے گئی تھی اور سڑک صاف ہو چکی تھی اور رکشے والے کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ہم ایس گیٹ کے قریب ہی تھے کہ کوئی سڑک پار کرتا ہوا ہمارے رکشہ میں الجھ گیا اور آہستہ سے گر گیا۔

وہ ایک عورت تھی جس کے سر میں سفید بالوں کی لٹیں تھی۔اس نے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے۔اس نے ہمارے سامنے سے گزرتے ہوئے خبرداری والا کوئی اشارہ نہ کیا تھا اور اچانک روانہ ہوئی۔گو کہ رکشے والے نے راستہ دیا مگر اس کا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا کوٹ جس کے

بٹن کھلے ہوئے تھے اور جو ہوا میں لہرا رہا تھا، رکشے میں پھنس گیا۔خوش قسمتی سے رکشہ والا تیز نہیں جا رہا تھا وگرنہ وہ بہت بری طرح گر جاتی اور سخت زخمی ہو جاتی۔

وہ وہیں زمین پر پڑی رہی اور رکشے والے نے رکشہ روک دیا۔لگتا نہیں تھا کہ بوڑھی عورت زخمی ہو گئی اور جو کچھ ہوا اس کا کوئی گواہ بھی نہ تھا۔اس لئے میں نے اس خوامخواہ کی خدمت گزاری کو برا سمجھا جو اُسے کسی مصیبت میں گرفتار کر سکتی تھی اور مجھے بھی گرفتار کرا سکتی تھی۔

''خیریت ہے''۔میں نے کہا ''چلو''۔

مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔شاید اس نے سنا نہیں۔وہ نیچے اترا اور آہستگی سے بوڑھی عورت کو کھڑے ہونے میں مدد دی۔ایک بازو سے اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا:

''تم ٹھیک ہو؟''۔

''مجھے چوٹ آئی ہے''۔

میں نے دیکھا تھا کہ وہ بہت آہستگی سے گری تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ زخمی نہیں ہوئی۔وہ یقیناً ٹھگی کر رہی تھی جو کہ قابلِ نفرت بات تھی۔رکشہ والے نے مصیبت کو دعوت دی تھی اور اب اسے بھگتنا تھا۔

مگر جونہی عورت نے کہا کہ وہ زخمی ہے تو رکشہ والے نے ایک لمحہ بھی تامل نہ کیا۔اس کا بازو پکڑے ہوئے وہ اسے آہستہ آہستہ چلنے میں مدد دینے لگا۔میں حیران تھا۔جب میں نے آگے دیکھا تو مجھے ایک پولیس سٹیشن نظر آیا۔تیز ہوا کی وجہ سے پولیس سٹیشن کے لوگ سب اندر تھے،اس لئے رکشہ والا بوڑھی عورت کو وہاں تک لے جانے میں مدد دے رہا تھا۔

اچانک مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔اُس لمحے اس کا جاتا ہوا خاک آلود ہیولا بڑا ہوتا گیا۔بلا شبہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا اس کا قد بڑا ہوتا جاتا۔جب بالآخر اسے دیکھنے کے لئے مجھے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھانا پڑا۔بہ یک وقت لگتا تھا کہ وہ مجھ پر بتدریج ایک دباؤ ڈالتا جاتا جو میرے فر کے کوٹ کے اندر چھوٹے جسم کو مغلوب کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

میں بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔لگتا تھا میرا قوتِ حیات منہدم ہو چکا ہو،میرا دماغ خالی تھا

۔جب بالآخر ایک پولیس والا باہر آیا۔ پھر میں رکشے سے نیچے اتر آیا۔

پولیس والا مجھ تک چلا آیا اور کہا ''کوئی دوسرا رکشہ کیجیے۔اب وہ آپ کو نہیں لے جا سکے گا''۔

کچھ بھی سوچے بنا میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے مٹھی بھر سکے نکالے اور پولیس والے کو دے دیے:

''براہِ کرم یہ اُسے دیجیے''، میں نے کہا۔

ہوا مکمل طور پر تھم چکی تھی مگر سڑک ابھی تک سنسان تھی۔ میں سڑک پر چلتا سوچ رہا تھا۔ مگر میں ان سوچوں کو اپنی طرف موڑتے ہوئے بہت خوفزدہ تھا۔ جو کچھ ابھی ابھی ہوا تھا، اسے ایک طرف رکھ کر، میں نے مٹھی بھر کر سکے کیوں دیے تھے؟۔ کیا یہ ایک انعام تھا؟۔ میں رکشے والے کا فیصلہ کرنے والا کون تھا؟۔ میں اپنے اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔

ابھی تک، یہ واقعہ میرے دماغ میں تازہ ہے۔ یہ اکثر مجھے بے چین کر دیتا ہے اور مجھے اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان برسوں کے سیاسی و فوجی معاملات کو میں بالکل اسی طرح بھول چکا ہوں جس طرح بچپن میں پڑھے ہوئے کلاسیک کو بھول چکا ہوں۔ لیکن یہ واقعہ میری طرف لوٹ لوٹ آتا ہے، اور اکثر یہ اصل زندگی سے بھی زیادہ واضح ہو کر آتا ہے، مجھے شرم کا درس دیتا ہوا، مجھے اپنی اصلاح کرنے پر اکساتا ہوا، اور مجھے تازہ جرأت اور امید بخشتا ہوا۔

چائے کی پیالی میں طوفان

سورج کی چمکدار زرد شعاعیں دریا کی لائی ہوئی ہموار مٹی پر آہستہ آہستہ مدھم پڑ چکی تھیں ۔ دریا کے کنارے درختوں کے پتے بالآخر ایک دھیمی سانس لینے کے قابل ہو گئے، اور ان کے نیچے چند دھاری دار مچھر ناچ اور گنگنا رہے تھے۔ دریا کے ساتھ ساتھ کسانوں کے گھروں کے چولہوں سے کم کم دھواں اٹھ رہا تھا، اس لیے کہ عورتوں اور بچوں نے اپنے دروازوں کے سامنے زمین پہ چھڑکاؤ کر لیا تھا اور چھوٹی میزیں اور سٹول باہر ڈال دیے تھے۔ آپ بتا سکتے تھے کہ یہ شام کے کھانے کا وقت تھا۔

نوجوان اور بوڑھے سب کے سب چھوٹے سٹولوں پر بیٹھ گئے اور باتیں کرتے ہوئے خود کو کیلے کے پتوں کے پنکھے جھلنے لگے۔ بچے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے یا درختوں کے نیچے آلتی پالتی مارے کنکروں کے ساتھ کھیلوں میں مصروف تھے۔ عورتیں گرم گرم شوربہ، خشک سبزیاں اور زرد چاول لا رہی تھیں۔ تفریحی کشتی میں کچھ دانشور گزرتے ہوتے ہوئے اس نظارے پہ ترنم سے گا رہے تھے:

''غموں سے آزاد فضا۔۔۔یہیں تو ہے دیہی شاعری کی اصل مسرت''۔

البتہ ان کی بات درست نہ تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے وہ بات نہیں سنی جو ''نو پاؤنڈی'' کہہ رہی تھی۔ بوڑھی مسز نو پاؤنڈی زبردست موڈ میں تھی۔ خود پہ کیلے کے پتوں والے پھٹے پرانے پنکھے سے ہوا جھل رہی تھی۔

''میں نے 70 برس تک جی لیا ہے۔ یہ اچھا خاصا عرصہ ہے۔ میں ہر چیز کو برباد ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مر جاؤں۔ ہم ابھی رات کا کھانا کھائیں گے، مگر وہ ابھی تک بھنے ہوئے لوبیا کھا رہے ہیں۔ اتنا کھا کر وہ ہمیں گھر سے باہر کر دیں گے''۔

اس کی پڑپوتی ''چھ پاؤنڈی'' ابھی ابھی مٹھی بھر لوبیا لیے اس کی طرف دوڑی دوڑی آئی تھی، مگر جب اس نے صورتحال دیکھی تو سیدھی بھاگ کر دریا کنارے گئی اور ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ پھر اپنے بالوں کی جڑواں لٹ کے چھوٹے سرے کو اونچا کرتے ہوئے زور سے چلائی:

''کبھی نہ مرنے والی بڑھیا!''

گو کہ معمر نو پاؤنڈی بہت بوڑھی ہو چکی تھی مگر وہ بہری بالکل نہ تھی۔ البتہ وہ ٹھیک طرح سے سن نہیں پائی کہ بچی نے کیا کہا۔ وہ اپنے آپ سے بڑبڑائی:

''ہاں، بے شک! ہر نسل پچھلی نسل سے خراب تر ہوتی ہے!''

اس گاؤں میں ایک برا رواج یہ تھا کہ مائیں پیدائش کے وقت بچے کا وزن کرتی ہیں۔ اور پھر جتنے پاؤنڈ کا وزن ہوگا۔ وہی اس کا نام ہوگا۔ بوڑھی نو پاؤنڈی اپنی پچاسویں سالگرہ کے زمانے سے ہر چیز میں نقص تلاش کرنے لگی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ اس کی جوانی کے زمانے میں گرمیوں کے موسم میں اتنی گرمی نہیں پڑتی تھی، نہ ہی چنے اتنے سخت ہوا کرتے تھے۔ المختصر، آج کی دنیا میں کچھ غلطی تھی۔ وگرنہ چھ پاؤنڈی بھلا کس طرح اپنے پردادا سے تین پاؤنڈ اور اپنے والد سات پاؤنڈی سے ایک پاؤنڈ کم نکلتی؟۔ یہ تو ایک ناقابلِ تردید ثبوت تھا۔ اسی لیے وہ زور شور سے دہراتی رہتی: ''ہاں، یقیناً ہر نسل پچھلی نسل سے خراب تر ہوتی ہے''۔

اس کے پرپوتے کی دلہن مسز سات پاؤنڈی چاولوں کی ایک ٹوکری لیے ابھی ابھی میز پہ آئی تھی۔ اسے میز پہ پٹختے ہوئے وہ غصہ سے بولی: ''آپ پھر غلط بولے جا رہی ہیں۔ پیدائش کے وقت چھ پاؤنڈی کا وزن چھ پاؤنڈ پانچ اونس تھا۔ آپ کا خاندان جو ترازو استعمال کرتا ہے وہ اٹھارہ اونس کا ایک پاؤنڈ تولتا ہے۔ اصلی سولہ اونس فی پاؤنڈ والے ترازو سے چھ پاؤنڈی کو سات پاؤنڈ سے زیادہ کا ہونا چاہیے تھا۔ میں یہ بھی نہیں مانتی کہ دادا اور والد کا وزن پورے نو یا آٹھ پاؤنڈ تھا۔

اس زمانے میں شاید لوگ 14 اونسی باٹ استعمال کرتے ہوں گے......''

''ہر نسل پچھلی والی نسل سے خراب ہوتی ہے!!''۔

اس سے پہلے کہ مسز سات پاؤنڈی جواب دیتی، اس نے دور سے اپنے خاوند کو آتے دیکھا اور اپنا غصہ اس کو زور سے پکارنے کی طرف موڑ دیا۔ ''ارے کام چور! تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ کہاں رہے ہو سارا وقت؟ تمھیں احساس ہی نہیں کہ تم کھانے پر ہمیں کتنا انتظار کرواتے ہو''۔

گو کہ مسٹر سات پاؤنڈی گاؤں میں رہتا تھا، مگر وہ ہر وقت اپنی آرائش و سنگھار میں مشغول رہتا۔ کچھ عرصہ قبل تک اپنے باپ کی طرح وہ بھی ایک کشتی پر کام کرتا تھا جو ہر صبح ''لوچن'' سے شہر جاتی تھی اور شام کو واپس لوٹتی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ وہاں کی ساری خبریں جانتا تھا۔ مثلاً وہ جانتا تھا کہ گرج چمک کے دیوتا نے کس جگہ ایک سو پاؤں والی روح کو آسمانی بجلی سے مار دیا تھا، یا کہاں پر ایک کنواری نے ایک بھوت کو جنا تھا۔ گو کہ وہ گاؤں میں مشہور ہو چکا تھا مگر اس کا خاندان دیہات کے رسم و رواج کی پابندی کرتا تھا اور گرمیوں میں رات کا کھانا لیمپ جلانے سے بہت پہلے کھایا کرتا تھا۔ لہٰذا اگر وہ دیر سے گھر لوٹتا تو اپنی زبان دراز بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ کا شکار ہو جاتا۔

مسٹر سات پاؤنڈی نے ایک ہاتھ میں ایک چھ فٹ لمبا دھبے دار بانس کا حقہ اٹھا رکھا تھا جس کی نئے کا سرا ہاتھی دانت کا تھا اور پیالہ جست کا تھا۔ وہ نرم رفتاری سے چلتا ہوا آیا اور ایک سٹول پر بیٹھ گیا۔ چھ پاؤنڈی نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور پھسل کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگی مگر وہ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔

''ہر نسل پچھلی نسل سے بدتر ہوتی ہے!''۔ بوڑھی نو پاؤنڈی بڑبڑائی۔

مسٹر سات پاؤنڈی نے آہستگی سے سر اٹھایا اور ایک گہری آہ نکال کر بولا: ''بادشاہ دوبارہ بحال ہو کر تخت پر بیٹھ گیا ہے۔''

ایک لمحے کیلئے تو مسز سات پاؤنڈی سکتے میں آ گئی۔ پھر اچانک اس خبر پہ تبصرہ کرتے ہوئے بولی:

''اچھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ ایک بار پھر معافی کا اعلان کر دے گا۔ ہیں ناں؟''

''میرے سر پر تو بالوں کی چٹیا نہیں ہے''۔ مسٹر سات پاؤنڈی نے دوبارہ آہ بھر کر کہا۔

''کیا بادشاہ سر پہ چٹیا رکھنے پہ اصرار کرے گا؟''۔

''ہاں''۔

مسز سات پاؤنڈی کسی قدر پریشان ہوئی۔ ''تمھیں کیسے پتہ؟''۔

وہ جھلاّ کر بولا۔ ''شراب خانے میں ہر شخص یہی کہہ رہا ہے''۔

اس پہ مسز سات پاؤنڈی کو فوراً احساس ہو گیا کہ معاملہ واقعی بہت خراب ہے۔ اس لیے کہ شراب کی دکان وہ جگہ ہے جہاں سے ساری خبریں ملتی ہیں۔ اس نے سات پاؤنڈی کے ٹنڈ کیے سر کی طرف غصہ سے دیکھا۔ اس کی نظروں میں نفرت اور پشیمانی تھی۔ پھر اس نے ایک پیالہ چاول سے بھرا اور یہ کہتے ہوئے غصے سے اس کے سامنے پٹختے ہوئے کہا:

''جلدی کرو، کھالو۔ رونے دھونے سے تمھاری چٹیا نہیں اُگے گی''۔ سورج نے اپنی آخری شعاعیں بھی واپس لیں اور تاریک ہوتا ہوا پانی آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ مٹی کے چبوترے پہ پیالوں اور چاپ سٹکوں کے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہاں موجود لوگوں کی پشتوں پہ پسینہ تھا۔ مسز سات پاؤنڈی نے چاول کے تین پیالے خالی کر دیے تو اس کی نظر اوپر اٹھی۔ اس نے جب منظر دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ درختوں کے بیچ میں سے مسٹر چاؤ کا موٹا ٹھگنا ہیولا نظر آیا جو کہ ایک تختے والے پل پر سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنا لمبا نیلا چوغا پہن رکھا تھا۔ مسٹر چاؤ ساتھ کے گاؤں میں شراب کی ایک بڑی دکان کا مالک تھا۔ اور دس میل کے علاقے کا واحد بارسوخ آدمی تھا۔

وہ کچھ کچھ تعلیمافتہ بھی تھا۔ تعلیم نے اسے پرانی نسل کے ایک بوسیدہ شخص کی صورت دے رکھی تھی۔ اس کے پاس چن شینگ تان کی ''تین سلطنتوں کے رومانس'' کی درجن بھر جلدیں تھیں۔ جنہیں وہ ہمیشہ بیٹھا پڑھ رہا ہوتا۔ وہ آپ کو نہ صرف پانچ شیر جرنیلوں کے نام بتا سکتا تھا بلکہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ ہوانگ چنگ کو، ہان شینگ بھی کہا جاتا ہے، اور ما چاؤ کا دوسرا نام مینگ چی تھا۔ سن یات سن والے جمہوری انقلاب کے بعد اس نے اپنے سر کی چوٹی تاؤ ازم کے ملاؤں کی طرح سر پر لپیٹ رکھی تھی۔

وہ اکثر آہ بھر کر کہتا کہ اگر چاؤ ین زندہ ہوتا تو بادشاہت اس قدر برے حالات میں نہ ہوتی۔

مسز سات پاؤنڈی کی نظر بہت اچھی تھی، اور اس نے یک دم تاڑ لیا کہ مسٹر چاؤ نے آج اپنے بال تاؤ ازم کے ملاّ کی طرح اوپر باندھ نہیں رکھے ہیں۔ بلکہ آج اس کے سر کے سامنے والا حصہ اُسترا کیا ہوا تھا اور اس کی گندھی ہوئی چٹیا نیچے لٹک رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بادشاہ دوبارہ بحال ہو کر تخت نشیں ہوا ہو گا۔ اور بادشاہت کی نشانی یہ ہے کہ اس میں چٹیا رکھنا لازمی قرار پائے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مسٹر سات پاؤنڈی کی زندگی اب خطرے میں ہو گی وگرنہ مسٹر چاؤ اپنا لمبا سوتی چوغہ بلا وجہ نہ پہنتا۔ اس نے یہ چوغا گذشتہ تین برسوں میں محض دو بار پہنا تھا۔ ایک بار جب اس کا دشمن ''چیچک کے داغوں والا'' آہ سزو بیمار پڑ گیا تھا، اور ایک بار جب اس کی شراب کی دکان میں توڑ پھوڑ کرنے والا ''لو'' مر گیا تھا۔ اب یہ تیسری بار تھی۔ اور اس کا مطلب یقیناً یہ تھا کہ کوئی ایسا واقعہ ہو گیا ہے کہ جس سے اس کا دل باغ باغ ہو گیا ہے اور جو کہ اس کے دشمنوں کیلئے بدبختی لانے والا ہے۔

مسز سات پاؤنڈی کو یاد آیا کہ دو سال قبل اس کے خاوند نے شراب کے نشے میں مسٹر چاؤ کو ''حرامزادہ'' کہا تھا۔ اسے یک دم اپنے خاوند کو درپیش خطرے کا احساس ہوا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

جب مسٹر چاؤ قریب سے گزرا تو کھانے پہ بیٹھے لوگ کھڑے ہو گئے اور اپنے چاولوں سے بھرے پیالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے: ''آئیے مسٹر چاؤ، کھانے میں شریک ہو جائیے''۔

مسٹر چاؤ نے گزرتے گزرتے سب کو سلام کہنے بازو اوپر اٹھایا اور کہا: ''آپ کھانا جاری رکھیے!'' وہ سیدھا سات پاؤنڈی کی میز پر چلا گیا۔ میز پر موجود ہر شخص اس سے ملنے کیلئے کھڑا ہو گیا۔ مسٹر چاؤ نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ''کھاتے رہیے''۔ اس دوران اس نے میز پہ موجود کھانے پہ اچھی طرح نظر دوڑائی۔

''اِن خشک سبزیوں کی خوشبو بہت اچھی ہے...... آپ لوگوں نے خبر سنی؟''۔ مسٹر چاؤ مسز سات پاؤنڈی کے مقابل کھڑے مسٹر سات پاؤنڈی کے پیچھے کھڑا تھا۔

''بادشاہ نے تخت سنبھال لیا ہے''۔ سات پاؤنڈی نے کہا۔

مسٹر چاؤ کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے مسز سات پاؤنڈی زبردستی مسکرائی ۔''اب جبکہ بادشاہ تخت پر بیٹھ گیا ہے تو عام معافی کا اعلان کب تک ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''عام معافی؟''۔ مسٹر چاؤ کی آواز مزید کرخت ہوگئی۔''مگر مسٹر سات پاؤنڈی کی چٹیا کا کیا بنے گا؟۔ یہ اہم بات ہے۔ تم لوگ بھی جانتے ہو کہ لمبے بالوں کے زمانے کا فقرہ کیا تھا:

''بال رکھو سر سے ہاتھ دھولو، سر رکھو بالوں سے ہاتھ دھولو۔۔۔''

سات پاؤنڈی اور اس کی بیوی نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ اس لیے یہ کلاسیکل ضرب المثل ان کے سروں کے اوپر سے گزر گئی۔ مگر انھوں نے فرض کر لیا کہ چونکہ تعلیم یافتہ چاؤ نے ایسا کہا ہے تو صورتحال واقعی بہت ابتر ہوگی۔ انھیں ایسا لگا جیسے انھیں سزائے موت ہوگئی ہو۔ ان کے کان بجنے لگے۔ اور وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہے۔

''ہر نسل گذشتہ نسل سے بدتر ہے''۔ بوڑھی مسز نو پاؤنڈی نے مسٹر چاؤ سے بات کرنے کا موقع اچک لیا۔''آجکل باغی، لوگوں کی چٹیائیں کاٹتے پھر رہے ہیں۔ جس سے نہ وہ بدھسٹ لگتے ہیں نہ تاؤاسٹ۔ کیا باغی پہلے بھی ایسا ہوتے تھے؟۔ میں اناسی برس کی ہوگئی ہوں اور یہ بہت بڑی عمر ہے۔ پرانے زمانے میں باغی اپنے سروں پر سرخ ساٹن باندھتے تھے جس کا ایک سرا ان کی ایڑھیوں تک لٹکا ہوتا تھا........ زرد ساٹن، سرخ ساٹن اور....... میں 79 برس کی ہوگئی ہوں''۔

''کیا کیا جاسکتا ہے؟''۔ مسز سات پاؤنڈی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔''ہمارا اتنا بڑا کنبہ ہے۔ جوان، بوڑھے۔۔۔ اور ہم سب کا انحصار اسی ایک پہ ہے''۔

''کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا''۔ مسٹر چاؤ کہنے لگا۔''چٹیا رکھے بغیر ہونے کی سزا ایک کتاب میں واضح لکھا ہوا ہے۔ اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا کنبہ کتنا بڑا ہے''۔

جب مسز سات پاؤنڈی نے سنا کہ یہ سزا ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے تو اس نے ساری امیدیں واقعی ترک کر دیں۔ پریشانی میں اسے اپنے علاوہ اپنے خاوند سے بھی نفرت ہونے لگی۔ اپنی چاپ سٹکوں کو اس کی ناک تک لا کر اشارہ کرتے ہوئے وہ چیخی:''تم نے اپنا تابوت بنا لیا۔ اب

تم اس میں لیٹ سکتے ہو۔ میں نے بغاوت کے دوران کہا تھا کہ کشتی کی طرف نہ جاؤ، شہر کی طرف نہ جاؤ۔ مگر تم کہاں رکنے والے تھے۔ نواب صاحب شہر چلا گیا اور انھوں نے اس کی چٹیا کاٹ ڈالی۔ تم نے خود اپنا تابوت بنا ڈالا، اب تمھیں اس میں لیٹنا ہوگا۔ تمھیں ہم لوگوں اس میں گھسیٹنے کا کیا حق حاصل تھا؟۔ پنجرے میں بند پرندے کی زندہ لاش!!...''

جب سے مسٹر چاؤ پہنچا تھا، گاؤں والوں نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور سب مسز سات پاؤنڈی کی میز کے گرد جمع ہوگئے۔ سات پاؤنڈی جانتا تھا کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بیوی لوگوں کے سامنے شوہر کو برا بھلا کہے۔ اس نے سر اٹھایا اور آہستگی سے کہنے لگا:

''آج تمھارے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے، مگر وقت پر.......''

''پنجرے میں بند پرندے کی زندہ لاش!!''۔

وہاں موجود حاضرین میں سے بیوہ پاپیی سب سے مہربان دل رکھتی تھی۔ اپنا دو سال کا بچہ اٹھائے ہوئے وہ مسز سات پاؤنڈی کے ساتھ کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ بات بہت بگڑ گئی ہے تو اس نے فوراً خوشگواریت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا :''کوئی بات نہیں مسز سات پاؤنڈی۔ لوگ روحیں نہیں ہیں کہ مستقبل کی پیشن گوئی کر سکتے ہوں۔ ؟۔ کیا تم نے خود اُس وقت یہ نہیں کہا تھا کہ چٹیا نہ رکھنے میں شرم کی کوئی بات نہیں؟۔ علاوہ ازیں سر کاری دفتر کے کسی بڑے افسر نے ابھی تک کوئی ایسے احکامات جاری نہیں کیے.....''۔

قبل اس کے کہ وہ اپنی بات ختم کرپاتی مسز سات پاؤنڈی کے کان سرخ ہوچکے تھے اور اس نے اپنے چاپ سٹک بیوہ کی ناک کے قریب لاتے ہوئے کہا:''نہیں، میں نے ایسا کبھی نہیں کہا ۔ اور بھلا یہ کوئی کہنے کی بات تھی۔ میں اس قدر مضحکہ خیز بات کیسے کہہ سکتی تھی؟۔ جب یہ واقعہ ہوا تھا تو میں پورے تین دن تک روتی رہی تھی۔ سب نے دیکھا۔ حتیٰ کہ وہ اپاہچ چھ پاؤنڈی بھی روئی تھی .....'' چھ پاؤنڈی نے ابھی ابھی چاول کا ایک پیالہ ختم کیا تھا اور خالی پیالہ آگے بڑھایا تھا تاکہ اسے پھر بھر دیا جائے۔ مسز سات پاؤنڈی غصے میں تھی۔ اس نے اپنے چاپ سٹک بچی کے سر پہ مارنے کے انداز میں کہا:

''بند کروشور، چھوٹی ڈائن!''۔

چھ پاؤنڈی کے ہاتھ سے خالی پیالہ زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ پیالہ ایک اینٹ کے کونے پر لگ گیا تھا۔اور ایک بڑا ٹکڑا اس سے الگ ہوگیا۔مسٹر سات پاؤنڈی پیالہ اٹھانے کے لیے اچھلا تاکہ دیکھ سکے کہ آیا اس کا ٹکڑا دوبارہ جڑ سکتا ہے یا نہیں۔

''جہنم میں جاؤ!''۔ وہ چیخا اور چھ پاؤنڈی کے منہ پر تھپڑ ماردی جس سے وہ زمین پر گر گئی۔ چھ پاؤنڈی وہیں پڑی روتی رہی جب تک کہ بوڑھی نو پاؤنڈی نے اسے اٹھالیا اور بڑبڑاتی ہوئی اس کے ساتھ چلی گئی:

''ہر نسل پچھلی نسل سے بدتر ہوتی ہے!!''۔

اب بیوہ پاپیی کے ناراض ہونے کی باری تھی۔'' بچے کو کیوں مارتے ہو تم لوگ؟'' وہ چیخی۔

مسٹر چاؤ مسکراتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا۔اسے بیوہ پاپیی کی یہ بات بری لگی کہ سرکاری دفتر کے بڑے افسر نے ابھی تک کوئی ایسے احکام جاری نہیں کیے۔اس نے میز کے قریب آتے ہوئے کہا:'' بچے کو مارنے سے کیا فائدہ؟۔شاہی فوج آنے والی ہے۔تمھیں معلوم ہے کہ سلطنت کا نائب جنرل چانگ فی ہے جس کا خاندان تین سلطنتوں سے نائب السلطنت چلا آرہا ہے۔اس کے پاس اٹھارہ فٹ لمبا نیزہ ہے اور وہ دس ہزار آدمیوں کا مقابلہ کرنے کی جرات رکھتا ہے۔ اس کے مقابل کوئی بھی کھڑا نہیں ہوسکتا''۔اس نے اپنے خالی ہاتھ نظر نہ آنے والے بڑے نیزہ کو دبوچنے کی طرح اوپر اٹھائے اور بیوہ پاپیی کی طرف دوتین قدم بڑھا کر بولا:'' کیا تم اس کے مقابلے کی ہو؟''۔

بیوہ پاپیی اپنے بچے کو تھامے غصے سے کانپ رہی تھی۔مگر جب مسٹر چاؤ اپنے پسینہ بھرے چہرے اور گھورتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا تو اسے اپنی زندگی خطرے میں محسوس ہوئی۔اپنے دل کی بات پوری کیے بغیر وہ وہاں سے چلی گئی۔مسٹر چاؤ بھی چلا گیا۔گاؤں والے بھی واپس چلے گئے مگر وہ بیوہ پاپیی کو مداخلت کرنے پر ملزم گردانتے جارہے تھے۔جن چند

لوگوں نے اپنی چٹیا کاٹ دی تھی، اب وہ اسے دوبارہ بڑھا رہے تھے۔وہ اس ڈر سے فوراً ہی ہجوم کے پیچھے چھپ گئے کہ مبادا مسٹر چاؤ انھیں دیکھ نہ لے۔البتہ مسٹر چاؤ ہجوم کے درمیان میں سے بغیر محتاط معائنہ کیے گزر گیا۔اچانک وہ درختوں کے جھنڈ سے واپس مڑا اور چیخا:''سوچ لو،تم لوگ اس کے مقابلے کے ہو؟''۔وہ تختے والے پل پر چڑھا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔

گاؤں والے حیران پریشان تھے۔ان کے دماغوں میں چیزیں خلط ملط ہوکر گھوم رہی تھیں۔انہیں احساس ہوا کہ وہ چانگ فی کے مقابلے میں واقعی کچھ بھی نہیں ہیں۔لہذا مسٹر سات پاؤنڈی کی زندگی سمجھو ختم ہوچکی۔اس لیے کہ اس نے شاہی قانون توڑا تھا۔گاؤں والوں نے محسوس کیا کہ اسے خانصاحبوں والا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔وہ تو لمبا حقہ پینے لگا تھا۔اب جبکہ یہ پکی بات تھی کہ وہ مصیبت میں تھا، تو ان لوگوں کو ایک طرح سے خوشی ہورہی تھی۔وہ چاہتے تھے کہ اس معاملے پر گفتگو کرتے رہیں مگر انھیں پتہ نہ تھا کہ کیا کہیں۔بھنبھناتے مچھر ایک ہوائی فوج کی طرح ان کے ننگے بازوؤں پر حملہ کرتے اور پھر راکٹ کی رفتار سے واپس درختوں کی جھنڈ میں چلے جاتے۔گاؤں والے اپنے اپنے گھروں کی طرف بکھر گئے، کواڑ بند کردیے اور سونے لگے۔خود سے بڑبڑاتی مسز سات پاؤنڈی نے برتن اٹھا لئے، میز اور سٹول صاف کیے اور خود بھی دروازہ بند کر کے سونے اندر چلی گئی۔

مسٹر سات پاؤنڈی ٹوٹا ہوا پیالہ اندر لے گیا۔اور دروازے کے چوکھٹ پہ بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔مگر وہ ابھی تک اس قدر پریشان تھا کہ حقے کے کش لگانا بھول گیا، اس کے ہاتھی دانت کے ماؤتھ پیس سے چھ فٹ دھاری دار بانس والے حقے کے جست کے پیالے میں روشنی بتدریج سیاہ پڑتی گئی۔لگتا تھا کہ معاملات ایک خطرناک حد تک پہنچ چکے ہیں۔اور وہ راہ نکالنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا۔مگر اس کی سوچیں گرداب میں پھنسی لگتی تھیں اور وہ انھیں سلجھا نہیں سکتا تھا۔''چٹیا، ہونہہ چٹیا؟۔ایک اٹھارہ فٹ لمبا نیزہ۔ ہر نسل گذشتہ نسل سے بدتر ہے! بادشاہ اپنے تخت پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ٹوٹے پیالے کو مرمت کیلئے شہر لے جانا پڑے گا۔اس کے مقابلے کا کون ہے؟۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے، جہنم میں جائے سب کچھ!!.............''

اگلی صبح مسٹر سات پاؤنڈی حسب معمول کشتی پر شہر چلا گیا۔شام کے وقت وہ اپنے چھ فٹ کے دھاری دار بانس کے حقے اور چاول کے پیالے سمیت واپس لوچن لوٹا۔رات کے کھانے پر اس نے معمر مسز نو پاؤنڈی کو بتایا کہ اس نے شہر میں پیالے کی مرمت کروائی۔ چونکہ پیالہ بری طرح ٹوٹا تھا اس لیے اس پر سولہ پتر لگانے پڑے اور ہر ایک تین سکّوں کا پڑا۔اس طرح کل اڑتالیس سکے خرچ ہوئے۔

’’ہر نسل پچھلی نسل سے بدتر ہے!!‘‘۔ بوڑھی مسز نو پاؤنڈی نے کہا’’میری عمر بہت ہو چکی ہے۔ایک پتر کے تین سکے۔ یہ اس طرح کے پتر نہیں ہیں جو ہمارے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔پرانے وقتوں میں۔۔۔آہ۔۔۔۔۔ میں 79 برس کی ہوں........‘‘۔

گو کہ مسٹر سات پاؤنڈی حسب معمول روزانہ شہر جاتا تھا، مگر اس کا گھر سیاہ بادلوں میں ہی گھرا رہتا۔گاؤں کے اکثر لوگ اس کے ساتھ ملنے جلنے سے کتراتے تھے۔اب وہ شہر کی خبریں سننے اس کے پاس نہ آتے تھے،مسز سات پاؤنڈی بھی ہر وقت غصے میں رہتی۔اور ہمہ وقت اسے’’پنجرے میں پرندے کی لاش‘‘ کے نام سے پکارتی تھی۔

پندرہ سولہ روز بعد سات پاؤنڈی شہر سے واپس لوٹا تو اس نے اپنی بیوی کو خلاف توقع خوش دیکھا۔

’’تم نے شہر میں کچھ سنا؟‘‘۔اس نے خاوند سے پوچھا۔

’’نہیں۔کچھ نہیں‘‘

’’کیا شہنشاہ دوبارہ تخت نشین ہو گیا؟‘‘

’’مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا‘‘۔

’’میرا خیال ہے کہ شہنشاہ دوبارہ بحال نہیں ہوگا۔آج میں مسٹر چاؤ کے شراب خانے کے سامنے سے گزری۔وہ حسب معمول بیٹھا پڑھ رہا تھا۔اور اس کی چٹیا سر کے گرد لپٹی ہوتی تھی۔ اس نے اپنا لمبا چوغہ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔اس سے لگتا ہے کہ شہنشاہیت بحال نہیں ہو رہی‘‘۔

آج پھر بیوی اس کی عزت کر رہی تھی اور اس سے اچھی طرح پیش آ رہی تھی۔گاؤں

والے بھی اس کی تکریم کر رہے تھے۔ابھی بھی گرمیوں میں اس کا خاندان گھر کے باہر مٹی کے چبوترے پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔اور راہ گیر مسکرا مسکرا کر اُن سے سلام دعا کرتے ہیں۔بوڑھی مسز نو پاؤنڈی نے کچھ عرصہ قبل اپنی 80 ویں سالگرہ منائی۔اور وہ ہمیشہ کی طرح چست و تندرست ہے اور شکایتیں کرتی رہتی ہے۔چھ پاؤنڈی کے سر کے بال اب جوڑے میں بدل گئے۔گو کہ انھوں نے اس کے پیر خوبصورت بنانے کیلئے حال ہی میں لوہے کے جوتوں میں باندھنا شروع کر دیے۔مگر وہ ابھی بھی چھوٹے موٹے کاموں میں مسز سات پاؤنڈی کا ہاتھ بٹاتی ہے۔اور سولہ پتر لگے چاول کے پیالے کو اٹھائے لنگڑاتی رہتی ہے۔

****

لمبے بال:۔1851 تا1864 کی کسان بغاوت یعنی تائی پنگ والی فوج۔چنگ بادشاہت کے قیام کے بعد حکم تھا کہ چینی مرد اپنی پیشانی پر سے سر کے سارے بال ٹنڈ کر دیں اور ہندو پنڈتوں کی طرح کی ایک چٹیا رکھ دلیں۔ چونکہ کسان بغاوت والے انقلابی،سر کو ٹنڈ کرنے کے حکم کو نہیں مانتے تھے اسلیے انھیں’’لمبے بال‘‘والے کہتے تھے۔

میرا پرانا گھر

سخت سردی سے لڑتے ہوئے میں سات سو میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے پرانے گھر پہنچا ۔وہ گھر، جو میں نے بیس برس قبل چھوڑا تھا۔

موسم سرما ختم ہونے والا تھا۔ میں جوں جوں اپنے پرانے گھر کے قریب پہنچتا گیا، دن ڈھلتا گیا۔ایک سرد ہوا کا جھونکا ہماری کشتی کے کیبن میں آیا۔ بانس کے ہمارے سایہ بان کے شگافوں میں سے محض چند تنہا تنہا گاؤں نظر آ رہے تھے، زندگی کے کسی نشان سے محروم، زردی مائل افق کے نیچے قرب وجوار میں بکھرے ہوئے۔ میں مغموم ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ارے۔تو کیا یہ وہی پرانا گھر تھا جسے میں گزشتہ بیس برس تک یاد کرتا رہا؟۔

میں جس پرانے گھر کو یاد کرتا تھا وہ اس کی طرح تو بالکل نہ تھا۔ میرا پرانا گھر تو بہت بہتر تھا لیکن اگر اب آپ مجھے اس کی خصوصی دلکشی بیان کرنے یا اس کی خوبصورتی بتانے کا کہہ دیں تو میرے پاس کوئی واضح خاکہ نہیں ہے، کوئی لفظ اسے بیان کرنے کیلئے نہیں ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی: گھر تو ہمیشہ اسی طرح تھا۔اور گو کہ یہ بہتر نہ ہوا مگر پھر بھی یہ اس قدر مایوس کن بھی نہیں ہے جتنا کہ میں تصور کر رہا ہوں۔ یہ تو محض میری طبیعت ہے جو تبدیل ہوگئی اس لئے کہ اس بار میں بغیر کسی واہمہ کے گاؤں جا رہا ہوں۔

اس بار میں الوداع کہنے آیا ہوں۔جس گھر میں ہمارا خاندان اتنے برسوں سے رہتا چلا آ رہا تھا وہ پہلے ہی فروخت ہو چکا تھا۔اور سال کے آخر تک اس کے مالک بدل جانے تھے۔ مجھے

سالِ نو کے دن سے قبل اس پرانے جانے پہچانے مکان سے ہمیشہ کے لئے الوداع کرنا تھا اور اپنا خاندان اپنے آبائی قصبہ سے بہت دور ایک اور جگہ منتقل کرنا تھا جہاں پہ میں کام کرتا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے میں اپنے گھر کے گیٹ پہ تھا۔ چھت پہ بکھری ہوا میں کانپتی گھاس کے تنکوں نے واضح طور پر جتلا دیا کہ پرانے گھر کے مالک کا بدلنا کیوں لازمی ہو گیا تھا۔ ہمارے خاندان کے کئی گھر پہلے ہی وہاں سے منتقل ہو چکے تھے۔اس لئے یہاں غیر معمولی خاموشی تھی۔ میں جب گھر پہنچا تو میری ماں استقبال کرنے پہلے ہی دروازے پر کھڑی تھی۔اور میرا آٹھ سالہ بھتیجا ''ھنگ ار'' اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا آیا تھا۔

گو کہ ماں بہت خوش ہوئی مگر وہ اپنے غم کو چھپانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔اس نے مجھے بیٹھ کر آرام سے چائے پینے کا کہا۔تا کہ جانے کے وقت کی بات کو ٹالا جا سکے۔ ہنگ ار نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ دور کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔

مگر بالآخر جانے کی گفتگو بہر حال کرنی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے پہلے ہی وہاں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا ہے۔اور کچھ فرنیچر بھی خرید لیا ہے۔ہمیں اس مکان کا سارا فرنیچر بیچنا ہوگا تا کہ ہم اور چیزیں خرید سکیں۔ ماں نے بتایا کہ تقریباً سارا سامان باندھا جا چکا ہے۔منتقل نہ کیے جا سکنے والے فرنیچر کا نصف بھی پہلے ہی فروخت ہو چکا ہے۔مشکل صرف یہ ہے کہ لوگوں سے وصولیابی کی جائے۔

''تم ایک آدھ دن آرام کرو، عزیزوں رشتہ داروں سے ملو، اور پھر ہم جائیں گے''۔ماں نے کہا۔

''اچھا''۔

''جُن تُو ہر وقت آ کر تمہارا پوچھتا رہتا ہے۔وہ تم سے ملنے کا بہت متمنی ہے۔میں نے تمہاری گھر واپسی کی ممکنہ تاریخ اُسے بتا دی۔وہ کسی بھی وقت آ سکتا ہے''۔

اسی وقت ایک عجیب تصویر میرے دماغ میں چمکی: گہرے نیلے آسمان پہ ایک سنہرا چاند معلق ہے اور اس کے نیچے ساحل ہے جس پر حد نظر تک سبز تربوز کاشت کئے گئے ہیں اور ان کے بیچ

چاندی کا زیور پہنے ایک دس گیارہ سالہ لڑکا ہاتھ میں فولاد کا ایک دوشاخہ تھامے اپنی پوری قوت سے ''ژا'' نامی جانور پر حملہ کر رہا ہے جو چکمہ دے کر بچ گیا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ میں سے بھاگ نکلا۔

یہ لڑکا جُن تُو تھا۔ جب میں پہلی بار اس سے ملا تو وہ دس برس کا تھا۔ یہ تیس برس پرانی بات ہے۔ اور اس زمانے میں میرا والد زندہ تھا۔ ہمارا کھاتا پیتا خاندان تھا۔ اس لئے میں واقعتاً ایک بگڑا ہوا بچہ تھا۔ اُس سال اجداد کے لئے قربانی کی باری ہمارے خاندان کی تھی۔ یہ قربانی چونکہ ہر تیس برس بعد ایک دفعہ آیا کرتی تھی۔ اس لئے یہ بہت اہم تھی۔ پہلے ماہ اجداد کی شبیہیں دکھائی گئیں اور قربانی دی گئی۔ اور چونکہ خیرات میں استعمال ہونے والے برتن بہت عمدہ تھے اور عبادت گزاروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے اس لئے چوری چکاری سے حفاظت لازمی ہوگئی تھی۔

ہمارے علاقے میں مزدوروں کی تین قسمیں تھیں: وہ جو کسی خاندان کے لئے سال بھر کام کرتے تھے کُل وقتی مزدور کہلاتے تھے۔ روزانہ اجرت والوں کو یومیہ کہا جاتا تھا۔ اور، جو لوگ اپنی زمین خود کاشت کیا کرتے تھے اور صرف سالِ نو پر، تہواروں پر، یا ٹیکس جمع کرتے وقت صرف ایک خاندان کے لئے کام کرتے تھے انہیں جز وقتی کہا جاتا ہے۔ ہمارے خاندان کے پاس محض ایک جز وقتی مزدور تھا۔ اور چونکہ بہت سارا کام کرنا تھا، اس نے میرے والد کو کہا کہ وہ قربانی کے کام میں ہاتھ بٹانے کیلئے اپنا بیٹا جُن تُو بھیجے گا۔

جب میرا والد رضا مند ہوا تو میں بے حد خوش ہوا۔ اس لیے کہ میں نے بہت عرصہ قبل جُن تُو کے بارے میں سن رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرا ہم عمر ہے۔ وہ پھندے لگاتا ہے اور چھوٹے بڑے پرندے پکڑتا ہے۔

میں ہر وقت سالِ نو کا انتظار کرتا تھا اس لئے کہ سالِ نو جُن تُو کو ساتھ لاتا تھا۔ آخر کار جب سال کا آخر آ گیا تو ایک دن ماں نے بتایا کہ جُن تُو آ گیا۔ اور میں اسے دیکھنے دوڑ پڑا۔ وہ باورچی خانے میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گول اور بھورا تھا۔ اس نے سر پہ ایک چھوٹا ٹوپ پہن رکھا تھا اور اس کے گلے میں چاندی کا زیور چمک رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا والد اُس سے بہت

پیار کرتا تھا اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ مر نہ جائے، اس نے دیوتاؤں اور بدھاؤں سے ایک عہد کیا تھا کہ وہ زیور کو ایک تعویز کے بطور استعمال کرے گا۔

وہ بہت ہی شرمیلا تھا۔ میں وہ واحد شخص تھا جس سے وہ خوفزدہ نہ تھا۔ جب وہاں کوئی اور موجود نہ ہوتا تو وہ مجھ سے باتیں کرتا۔ لہٰذا چند گھنٹوں میں ہم گہرے دوست بن گئے۔

پتہ نہیں تب ہم نے کیا کیا باتیں کیں مگر مجھے یاد ہے کہ جن تُو بہت اچھے موڈ میں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جب سے وہ شہر آیا ہے، اس نے کئی نئی چیزیں دیکھی ہیں۔

اگلے روز میں نے اس سے پرندے پکڑنے کی خواہش کی۔

''ناممکن''۔ اس نے کہا۔ ''ایسا تو سخت برفباری کے بعد ہی ممکن ہو سکے گا۔ برفباری کے بعد، میں زمین کا ایک ٹکڑا صاف کرتا ہوں، پھر ایک لکڑی کے سہارے ایک بڑی ٹوکری کھڑی کرتا ہوں اور اس کے نیچے بھوسہ پھیلا دیتا ہوں۔ جب پرندے چگنے کے لئے وہاں آ جاتے ہیں تو میں لکڑی سے بندھی رسی کو کھینچ لیتا ہوں اور پرندہ اس ٹوکری کے نیچے آ کر بند ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کے پرندے: جنگلی کبوتر، تیتر، چکور۔۔۔۔''

تب میں نے بہت شدت سے برفباری کا انتظار کیا تھا۔

ایک اور موقع پر جُن تُو نے کہا: ''ابھی خوب سردی پڑ رہی ہے۔ مگر تم گرمیوں میں ہمارے ہاں ضرور آنا، دن کے وقت ہم ساحل پہ سیپیاں جمع کرنے جایا کریں گے۔ سبز، سرخ، ہر رنگ کے۔ شام کو جب میں اور والد تربوز دیکھنے جائیں گے تو تم بھی ساتھ آنا''۔

''کیا چوروں کو بھگانے جاتے ہو؟''

''نہیں۔ اگر راہ گیر پیاسا ہو اور ایک تربوز اٹھا لے تو ہمارے علاقے میں اسے چوری نہیں سمجھا جاتا۔ ہم تو ژا، بجو، اور خار پشت جیسے جانوروں سے حفاظت کرنے جاتے ہیں۔ جب چاندنی میں آپ تربوز کھاتے ہوئے ژا کی کرچ کرچ کرنے کی آواز سنیں تو آپ اپنا دوشاخہ اٹھاتے ہیں اور کمال ہوشیاری سے اس پر حملہ کرتے ہیں۔۔۔''

مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ ژا کیا چیز ہوتی ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں اب بھی

واضح طور پر نہیں جانتا۔ مگر میں نے اتنا محسوس کیا کہ یہ چھوٹے کتے جیسی شئے ہوتی ہے اور بہت خوفناک ہوتی ہے۔

''وہ کاٹتے نہیں؟''

''لوگوں کے پاس ایک دوشاخہ ہوتا ہے۔ جب انہیں ژا نظر آجائے تو گھونپ دیتے ہیں۔ یہ بہت مکار جانور ہوتا ہے۔ وہ سیدھا آدمی کی طرف دوڑے گا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل جائے گا۔ اس کے بال چربی کی طرح پھسلن والے ہوتے ہیں۔۔۔''

مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ ساری عجیب چیزیں وجود رکھتی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ساحل پر قوسِ قزح کے ہر رنگ کی سیپیاں موجود ہیں، یا، خربوزے اس قدر خطرے میں ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بکتے ہیں۔

''ہمارے ساحل پر جب لہر آتی ہے تو ان کے ساتھ چھلانگ لگانے والی بے شمار مچھلیاں آجاتی ہیں جن کی مینڈک کی طرح دو ٹانگیں ہوتی ہیں۔

جُن تُو کا دماغ اس طرح کی عجیب مقامی روایتوں کا خزانہ تھا، میرے سابقہ دوستوں کے تصور سے باہر۔ وہ ان سب چیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ سب میری طرح اپنے گھر کی بلند چار دیواری کے اوپر آسمان کے چار کونے ہی دیکھ سکتے تھے۔ جبکہ جُن تُو سمندر کے پاس رہتا تھا۔

بدقسمتی سے جُن تُو کو سالِ نو کے ایک ماہ بعد گھر جانا پڑا۔ میرے آنسو نکل پڑے اور اس نے باورچی خانہ میں پناہ لی۔ وہ رو رہا تھا اور باہر آنے سے انکار کر رہا تھا۔ پھر بالآخر اس کا باپ اُسے ساتھ لے گیا۔ بعد میں اُس نے اپنے والد کے ہاتھ میرے لئے سیپیوں کا ایک پیکٹ اور چند بہت ہی خوبصورت پَر بھیج دیئے اور میں نے بھی ایک دو بار اسے تحفے بھیجے۔ مگر ہم دوبارہ ملے کبھی نہیں۔

اب جب میری ماں نے اس کا ذکر کیا تو بچپن کی یہ یاد ایسے اچھل کر زندہ ہوئی جیسے بجلی کوندتی ہو۔ میں نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔ ویسے اس کا کیا حال ہے؟''

''وہ بالکل بھی خوشحال نہیں ہے''۔ ماں نے کہا۔ پھر وہ دوبارہ دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''وہ لوگ پھر آرہے ہیں۔ کہتے تو ہیں کہ فرنیچر خریدنے آرہے ہیں لیکن دراصل وہ یہ دیکھنے آرہے ہیں کہ وہ کون کون سی چیز اٹھا سکتے ہیں۔ میں جاتی ہوں اور ان پر نگاہ رکھتی ہوں''۔

ماں باہر چلی گئی۔ باہر عورتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے ہنگ ار کو پاس بلایا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آیا وہ لکھنا جانتا ہے، اور کیا وہ جانے میں خوش ہے؟

''کیا ہم ٹرین کے ذریعے جائیں گے؟''

''اور کشتی؟''

''ہاں، ہم پہلے کشتی لیں گے''۔

''آہا، اس طرح! اتنی بڑی مونچھ کے ساتھ!''۔ اچانک ایک عجیب کھنکتی آواز گونجی۔ میں نے اس کی طرف نگاہ کی۔ وہ تقریباً 50 برس کی عورت تھی۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ پتلے تھے۔ اس نے اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سکرٹ کے بجائے شلوار پہن رکھی تھی۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر میرے آمنے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے بچوں کے جیومیٹری بکس کی پرکار ہو۔ میں حیران ہو گیا۔

''تم مجھے نہیں جانتے؟۔ ارے، میں نے تمہیں اپنی گود میں رکھا ہے''۔

میں مزید حیران ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اسی وقت میری ماں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔

''اسے معاف کرنا۔ وہ بہت عرصہ باہر رہا ہے، بھول گیا ہوگا''۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''یاد کرو۔ یہ تو سڑک کے اُس پار والی بیگم یانگ ہے۔۔۔ اس کی دکان ہے''۔

پھر مجھے واقعی یاد آیا۔ جب میں بچہ تھا تو سڑک کے اس پار دکان میں ایک بیگم یانگ ہوتی تھی۔ سب لوگ اسے دکان والی حسینہ کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ اپنے چہرے پر پاؤڈر لگایا کرتی

تھی۔اس زمانے میں اس کے گالوں کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئی نہ تھیں، نہ ہی اس کے ہونٹ اس قدر پتلے تھے۔مزید برآں چونکہ وہ ہر وقت بیٹھی رہتی تھی اس لئے میں نے کبھی بھی اس میں پرکار کی مشابہت محسوس نہیں کی تھی۔ان دنوں لوگ کہتے تھے کہ دکان اسی کے طفیل چلتی تھی۔لیکن شاید اپنی کمسنی کی وجہ سے میں اس سے متاثر نہیں ہوا تھا۔اور بعد میں تو اسے مکمل طور پر بھول گیا۔بہرحال پرکار بہت زیادہ توہین آمیز موڈ میں تھی اور میری طرف بہت زیادہ ہتک آمیز انداز میں دیکھ رہی تھی۔بالکل اسی طرح جیسے کسی فرانسیسی نے نپولین کا نام نہ سنا ہو، یا ایک امریکی جس نے واشنگٹن کے بارے میں نہ سنا ہو۔اس نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''اچھا۔۔۔مجھے بھول گئے ہو؟۔ہاں ہاں ظاہر ہے کہ میں تمہارے برابر کی جو نہیں ہوں........؟''۔

''نہیں،نہیں۔۔ایسا بالکل نہیں ہے۔۔۔میں، میں۔۔۔'' میں کھڑے ہوتے ہوئے ہکلاتے ہوئے بولا۔''میری بات سنو مسٹر سون۔تم امیر بن چکے ہو۔اور وہ اتنے بھاری ہیں کہ ہلائے نہیں جا سکتے۔تمہیں اب اس فرنیچر کی کوئی ضرورت نہ رہی۔اس لئے یہ مجھے لے جانے دو۔ہم جیسے غریب لوگ انہیں استعمال کریں گے۔''

''میں امیر نہیں ہوا۔میں انہیں بیچ کر اپنے لئے نیا۔۔۔۔''

''ارے چھوڑو۔تم افسر بنا دیئے گئے ہو۔پھر تم کیسے کہتے ہو کہ تم امیر نہیں ہو؟۔تمہارے پاس اب تین تین داشتائیں ہیں۔اور تم جہاں کہیں جاتے ہو وہاں ایک بہت بڑی ڈولی والی کرسی مع آٹھ خدمتگاروں کے ساتھ ہوتی ہیں۔پھر بھی کہتے ہو کہ تم امیر نہیں ہو؟ ہونہہ۔ارے تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتے''۔

مجھے پتہ تھا کہ میں کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔اس لئے میں خاموش رہا۔

''بات کرو ناں! لوگ جتنا امیر ہو جاتے ہیں اسی قدر دکھی ہوتے ہیں۔اور جتنے زیادہ دکھی ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی زیادہ پیسہ ان کے پاس آتا رہتا ہے۔۔۔'' پرکار نے مڑتے ہوئے ہتک آمیز انداز میں کہا۔وہ آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔اور جاتے جاتے لاپرواہی سے میری ماں کے

دستانے اٹھائے اور اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔

اس کے بعد آس پاس موجود بہت سارے عزیز و اقارب ملنے آئے۔ان کے آنے جانے کے وقفوں کے درمیان کچھ نہ کچھ پیکنگ جاری رہی۔اس طرح تین چار دن گزر گئے۔

ایک بہت ہی سرد سہ پہر کو کھانا کھانے کے بعد میں بیٹھا چائے پی رہا تھا جب مجھے کسی کے اندر آ جانے کا احساس ہوا۔میں نے اسے دیکھنے کے لئے منہ موڑا۔پہلی ہی جھلک پہ میں غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے استقبال کے لئے اس کے پاس چلا گیا۔

یہ شخص جُن تُو تھا۔گو کہ میں اسے پہلی نظر میں پہچان گیا مگر یہ، وہ جُن تُو بالکل نہیں تھا جسے میں جانتا تھا۔اس کا جسم دوگنا بڑھ گیا تھا۔اس کا گول چہرہ جو ایک زمانے میں سرخ تھا، زرد ہو چکا تھا۔اور اس پر گہری لکیریں اور جھریاں پڑ چکی تھیں۔اس کی آنکھیں اس کے باپ جیسی بن چکی تھیں۔آنکھوں کے کنارے سوجھ گئے تھے اور سرخ ہو گئے تھے۔ویسے ہی جیسے کہ اُن کسانوں کے ہوا کرتے ہیں جو سمندر کے پاس کام کرتے ہیں اور سارا دن سمندر سے آنے والی ہواؤں کی زد میں رہتے ہیں۔اس نے ایک ڈھیلی ڈھالی ٹوپی پہن رکھی تھی۔اس کی جیکٹ بھی بہت باریک تھی جس کے نتیجے میں وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔اس نے کاغذ کا ایک بڑا تھیلا اٹھا رکھا تھا اور ایک لمبا حقہ بھی۔اس کے ہاتھ بھی اب اُس طرح سرخ نہ تھے جس طرح کہ مجھے یاد تھے۔وہ اب ایک چلغوزے کی درخت کے ایک چھال کی طرح کھردرے، اور خشک تھے۔

میں اس قدر خوش ہوا کہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔''ارے۔جن تو۔۔۔تو یہ تم ہو؟۔۔۔''

اس کے بعد میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا جو موتی کے ہار کے دانوں کی طرح اترنے والی تھیں: تیتر، اچھلتی مچھلیاں، سیپیاں، ژا۔۔۔مگر میں تو جیسے گنگ ہو گیا تھا۔میں، ذہن میں آئی ہوئی چیزوں کو الفاظ میں تبدیل کرنے کے قابل نہ تھا۔

وہ وہیں کھڑا تھا۔اس کے چہرے پر مسرت اور غم کے ملے جلے تاثرات تھے۔اس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر اس نے ایک بھی آواز نہ نکالی۔بالآخر بہت ہی مودبانہ لہجہ اختیار کئے ہوئے

وہ واضح انداز میں بولا:

''مالک!۔۔۔''

مجھے اپنے اندر ایک کپکپی محسوس ہوئی۔اس لئے کہ مجھے اسی وقت معلوم ہوگیا کہ ہمارے بیچ کتنی موٹی دیوار کھڑی ہوچکی تھی۔میں پھر بھی کچھ نہ بول سکا۔

وہ کسی کو آواز دینے کے لئے مڑا۔

''شوئی شنگ!مالک کے سامنے جھک جاؤ''۔تب اس نے ایک لڑکے کو آگے کھینچا جو کہ اس کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔اور وہ ہو بہو بیس برس قبل والا جُن تُو تھا۔بس ذرا سا زیادہ پیلا اور ذرا سا زیادہ پتلا۔اور اس نے کوئی چاندی والا زیور بھی نہیں پہن رکھا تھا۔

''یہ میرا پانچواں ہے''۔وہ بولا''اسے میل جول کی عادت نہیں ہے اس لئے شرمیلا اور جھجکیلا ہے''۔

ماں،ہنگ ار کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے آئی۔اس نے شاید ہماری آواز سنی تھی۔

''مالکن ، مجھے آپ کا خط ملا تھا''۔جُن تُو بولا۔''مجھے مالک کے واپس آنے کی خبر سے بہت خوشی ہوئی تھی۔۔۔''

''تم اتنی تکلف کیوں کررہے ہو؟۔کیا تم بچپن میں اکٹھے کھیلتے نہیں رہے ہو؟''ماں نے کہا۔''تمہیں اب بھی اسے پہلے کی طرح بھائی سون کہنا چاہیے تھا''۔

''اوہ،آپ تو واقعی.......ایسا کہنا تو بڑی گستاخی ہوگی۔اُس وقت تو میں بچہ تھا،ناسمجھ تھا''۔باتوں کے دوران جُن تُو نے شوئی شنگ کو آگے کردیا اور جھکا دیا مگر بچہ شرمیلا تھا۔وہ اپنے باپ کے پیچھے چپ چاپ کھڑا تھا۔

''اچھا؟۔یہ ہے شوئی شنگ؟۔تمہارا پانچواں؟''۔ماں نے پوچھا۔''ہم سب اجنبی ہیں۔تم اس پہ شرمیلے پن کا الزام نہیں دے سکتے۔بہتر ہوتا اگر ہنگ ار،اسے باہر لے جاکر اس سے کھیلے''۔

جب ہنگ ار نے سنا تو وہ شوئی شنگ کے پاس چلا گیا اور شوئی شنگ اس کے ساتھ باہر

چلا گیا،بالکل آرام سے۔میں نے جُن تُو کو بیٹھنے کا کہا،اور وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد بیٹھ گیا۔پھر اپنے پائپ کو میز پر جھکاتے ہوئے اس نے کاغذ کی ایک تھیلی حوالے کرتے ہوئے کہا:

''سردیوں میں لانے کے قابل تو کوئی چیز ہوتی نہیں،مگر یہ پھلیاں ہم نے خود سُکھا دیں ،مالک!اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو۔۔۔''

جب میں نے اس کا حال چال پوچھا تو وہ سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا:

''بہت بری حالت ہے جی۔حالانکہ میرا چھٹا بھی کچھ نہ کچھ کام کرتا ہے مگر پھر بھی کھانے کو کافی نہیں ہے۔۔۔اور پھر تحفظ نہیں ہے۔۔۔ہر طرح کے لوگ پیسہ چاہتے ہیں۔کوئی معین قوانین ہیں نہیں۔۔۔۔اور فصلیں خراب ہوجاتی ہیں۔آپ چیزیں اگائیں اور جب منڈی لے جائیں تو کئی قسم کے ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں۔اور اگر بیچنے میں دیر کردو تو چیزیں خراب ہوجاتی ہیں۔۔۔''

وہ اپنا سر ہلاتا رہا۔اور گو کہ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا مگر ان میں سے ایک بھی نہ ہلا۔جیسے وہ پتھر کا مجسمہ ہو۔بلاشبہ وہ حد سے زیادہ تلخ لگ رہا تھا مگر اس کا اظہار نہیں کرسک رہا تھا۔ایک وقفے کے بعد اس نے حقہ نکالا اور خاموشی سے پینے لگا۔

اس سے گفتگو کرنے میں ماں کو معلوم ہوا کہ آج کل وہ مصروف ہے اور اگلے ہی دن اُسے جانا ہے۔اور چونکہ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لئے ماں نے اسے باورچی خانے جاکر اپنے لئے چاول ابالنے کا کہا۔

جب وہ چلا گیا تو میں اور ماں دونوں نے اس کی کٹھن زندگی پہ ہمدردی سے سر ہلائے۔۔۔بہت سارے بچے، قحط سالیاں، ٹیکسوں کی بھرمار، سپاہی، ڈاکو، سرکاری اہلکار اور زمیندار اشرافیہ۔۔۔ان سب نے اُسے نچوڑ کر ایک ممی کی طرح خشک کردیا تھا۔ماں نے کہا کہ ہمیں وہ ساری چیزیں اسے دینی چاہئیں جو ہم ساتھ نہیں لے جاسکتے۔

اس سہ پہر اس نے کئی چیزیں اٹھالیں:دو بڑی میزیں، چار کرسیاں، ایک اگربتی ہولڈر ، اور موم بتیاں، اور ایک ترازو۔اس نے ہمارے سٹوو کی راکھ بھی مانگ لی۔(ہمارے علاقے

میں لوگ جھاڑیاں وغیرہ جلاتے ہیں اور اس کی راکھ ریتلی زمین کو زرخیز بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں)۔اس نے کہا کہ جب ہم لوگ چلے جائیں گے تو وہ کشتی کے ذریعے انہیں لے جائے گا۔

رات کو ہم نے پھر باتیں کیں مگر کسی سنجیدہ موضوع پہ نہیں۔اور اگلی صبح وہ شوئی شنگ کے ساتھ چلا گیا۔

نو دن گزرنے کے بعد ہمارے جانے کا وقت آیا۔جُن ٹُو صبح سویرے آ گیا۔شوئی شنگ اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔۔۔وہ محض ایک پانچ سالہ بچی ساتھ لایا تھا تاکہ کشتی کا خیال رکھ سکے۔ہم سارا دن مصروف رہے، اور گفتگو کرنے کے لئے وقت نہ نکال سکے۔بہت سارے ملاقاتی ہمیں ملنے بھی آئے۔کچھ الوداع کہنے، کچھ چیزیں اٹھانے اور کچھ دونوں کام کرنے۔ہمیں کشتی کے ذریعے نکلتے نکلتے شام پڑ گئی تھی۔اور اس وقت تک گھر کی ہر چیز، خواہ کتنی پرانی اور خستہ حال ہو، خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو، عمدہ ہو یا کھردری۔۔۔صاف کر دی گئی تھی۔

شام ڈھلے جب ہم روانہ ہوئے تو دریا کے دونوں طرف کے سرسبز پہاڑ گہرے نیلے رنگ کے ہوتے گئے اور کشتی کے دنبالے کی طرف پیچھے ہٹتے گئے۔

ہنگ ار، اور میں کیبن کھڑکی کی طرف جھکے ہوئے باہر کے مناظر دیکھ رہے تھے جب اچانک اس نے پوچھا:

''انکل، ہم دوبارہ کب واپس آئیں گے؟''

''واپس؟۔یعنی جانے سے پہلے ہی تم واپس آنے کا سوچ رہے ہو؟''

''جی۔۔۔وہ۔۔۔۔شوئی شنگ نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا ہے۔۔۔''

اس نے مشتاق تفکر کے ساتھ اپنی وسیع کالی آنکھیں کھولیں۔

ماں اور میں دونوں غمگین ہو گئے۔اور جُن ٹُو کا نام دوبارہ آ گیا۔ماں نے کہا کہ جب سے ہمارے خاندان نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا تھا مسز یانگ دکان سے تقریباً ہر روز آ جاتی۔اور پرسوں اس نے راکھ کے ڈھیر کے نیچے درجن بھر کٹورے اور پلیٹیں کھود نکالیں اور بحث کے

دوران اصرار کیا کہ یہ ضرور جُن ٹُو نے دفن کی تھیں تاکہ جب وہ راکھ لے جانے آ جائے تو یہ چیزیں بھی ساتھ لے جائے۔یہ انکشاف کر کے مسز یانگ اپنے تئیں بہت خوش ہوئی تھیں۔اور ''کتا ستانے والے پنجرے'' کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے چلی گئی۔(ہمارے علاقے میں مرغیاں پالنے والے لوگ کتا ستانے والا پنجرہ استعمال کرتے ہیں۔یہ لکڑی کا ایک پنجرہ ہوتا ہے جس کے اندر خوراک رکھ دی جاتی ہے تاکہ مرغیاں خوراک کھانے کے لیے اپنی گردنیں لمبی نہ کریں مگر کتے محض غصے سے دیکھتے رہیں)۔

پرانا گھر دور ہوتا چلا گیا اور میرے پرانے گھر کی پہاڑیاں اور دریا بھی بتدریج پیچھے ہٹتے ہٹتے بہت دور ہوتے گئے۔مگر مجھے پشیمانی نہ تھی۔مجھے صرف یہ لگا جیسے میرے گرد ایک ان دیکھی بلند دیوار تھی جو مجھے اپنے لوگوں سے کاٹ رہی تھی۔اس تصور سے میں مکمل طور پر بجھ سا گیا۔تربوزوں کے درمیان چاندی کے زیور والے اس ہیرو کا تصور پہلے تو روشن دن کی طرح واضح تھا مگر اب یہ اچانک دھندلا گیا اور میری غمگینی میں اضافہ کر گیا۔

ماں اور ہنگ ار سو گئے۔

میں لیٹا کشتی کے نیچے پانی کی لہروں کو سن رہا تھا۔اور جانتا تھا کہ میں اپنی راہ جا رہا تھا۔ میں نے سوچا: گو کہ میرے اور جُن ٹُو کے بیچ اتنا بڑا خلیج حائل ہے مگر بچوں کے بیچ اب بھی بہت کچھ مشترک ہے۔ابھی تو ہنگ ار، شوئی شنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔مجھے امید ہے کہ وہ ہماری طرح نہیں ہوں گے، وہ اپنے بیچ کوئی رکاوٹ پیدا ہونے نہ دیں گے۔مگر پھر وہ مجھے اچھے نہ لگے۔ان کے پاس نئی زندگی ہونی چاہیے، ایک ایسی زندگی جس کا ہم نے کبھی تجربہ نہ کیا ہو۔

امید کی رسائی نے اچانک مجھے خوفزدہ کر دیا۔جس وقت جُن ٹُو نے اگربتی ہولڈر اور موم بتیاں مانگی تھیں تو میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں اس پر ہنسا تھا کہ وہ ابھی تک بتوں کی پرستش کرتا ہے اور انھیں دل سے نکال نہیں سکتا۔پھر جس چیز کو میں امید کہہ رہا تھا وہ بھی تو ایک بت تھی جسے میں نے خود تخلیق کر رکھا تھا۔فرق صرف یہ تھا کہ جس چیز کی اس نے خواہش کی تھی وہ قریب تھی، دسترس میں تھی، جبکہ جس چیز کی میں خواہش کر رہا تھا وہ کم آسانی سے حقیقت بن سکتی تھی۔

جب میں جمائیاں لینے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک نیلم کی طرح سبز ساحل پھیل گیا۔ اوراوپر گہرے نیلے آسمان میں ایک گول سنہرا چاند نظر آیا۔ میں نے سوچا: امید کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ وجود رکھتا ہے ۔ نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ وجود نہیں رکھتا ۔ یہ محض زمین پر موجود سڑکوں کی طرح ہے ۔ اس لیے کہ درحقیقت زمین پر پہلے سڑکیں نہ تھیں مگر جب بہت سے لوگ ایک ہی راستے سے گزرنے لگے تو ایک سڑک بن گئی۔

ایک مسرور خاندان

’’............انسان تبھی لکھتا ہے جب اُسے اس کی خواہش ہوتی ہے۔ اس طرح کی تحریر سورج کی روشنی جیسی ہوتی ہے جو بہت دور موجود چمک کے سرچشمے سے آ رہی ہو۔ نہ کہ ایک چقماق کی رگڑ سے پیدا شدہ چنگاری کی طرح۔ یہی واحد آرٹ ہوتی ہے اور اسی طرح کا مصنف ہی سچا آرٹسٹ ہوتا ہے............مگر میں............ میں کس شمار میں آتا ہوں؟‘‘۔

بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اچانک بستر سے اچھل کر باہر آ گیا۔ اُسے لگا کہ اسے لکھنے سے کچھ پیسے کمانے چاہییں تاکہ وہ خاندان کی کفالت کر سکے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے مسودے ’’مسرور ماہانہ پبلشرز‘‘ کو بھیجے گا اس لیے کہ اس کے معاوضے نسبتاً اچھے تھے۔ مگر اس صورت میں مضامین کا انتخاب اُن کے ہاتھ میں ہوگا اور اس طرح یہ انتخاب محدود ہو جائے گا، بصورت دیگر تحریر کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ چلو ٹھیک ہے، اسے محدود ہونے دو۔

نوجوان نسل کے ذہنوں میں سب سے بڑے مسائل کیا ہیں؟............ بلاشبہ ان مسائل کی تعداد کم ہوگی، محبت سے متعلق، شادی، خاندان............ ہاں، یقیناً بہت سارے لوگ ایسے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ وہ ان پر بحثیں کرتے ہیں۔ چنانچہ خاندان کے بارے میں لکھا جائے! مگر کس طرح لکھا جائے؟............بصورت دیگر پبلشر اس کی تحریر قبول نہ کرے گا۔

کیوں بدقسمتی کی پیشن گوئی کی جائے؟ پھر بھی............

بستر سے اچھل کر وہ تین چار قدموں میں ڈیسک تک پہنچا۔ بیٹھ گیا، سبز لائنوں والا ایک

کاغذ نکالا اور فوراً ہی عنوان لکھا: ایک مسرور خاندان۔

اس کا قلم فوراً ہی رک گیا۔ اس نے سر اٹھایا، اپنی دونوں آنکھیں چھت پر ٹکا دیں اور اس مسرور خاندان کے لیے ایک ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''پیکنگ؟'' اس نے سوچا۔ ''نہیں اِس سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بہت زیادہ مردہ شہر ہے، حتیٰ کہ اس کی فضا بھی مردہ ہے۔ نہیں، یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ کیا ننکسو اور چکیانگ کسی بھی دن لڑائی شروع کرلیں گے۔ سی چو آن؟ گوانگ تنگ؟۔ وہ تو جنگ کے بیچ میں ہیں۔ شان تنگ یا ہونان کیسے رہیں گے؟............نہیں نہیں، وہاں تو میاں بیوی میں سے ایک کو اغواء کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہوجائے تو مسرور خاندان ایک ناشاد خاندان بن جائے گا۔ شنگھائی اور ٹی انٹس کے خارجی ممالک والے علاقوں میں کرائے بہت زیادہ ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ یونان اور کوی چواؤ کیسے شہر ہیں، مگر وہاں سڑکیں بہت بری حالت میں ہیں............''۔

اس نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا مگر اُسے کوئی اچھی جگہ نہیں سوجھی۔ اس لیے اُس نے جگہ کا نام ''A'' رکھا............ البتہ اس نے سوچا کہ ''آج کل بہت سے لوگ جگہوں یا انسانوں کے ناموں کے لیے مغربی حروفِ تہجی کے استعمال پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح قارئین کی دلچسپی کم ہوجائے گی۔ مجھے یہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس صورت میں کونسا مقام اچھا ہوگا؟ ہونان میں بھی لڑائی ہورہی ہے؛ ڈیرین کے کرائے پھر بڑھ گئے ہیں۔ چاہار، کیرین اور ہیلنگ کیانگ کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ وہاں غنڈے بہت ہیں، اس لیے وہ بھی استعمال نہیں کیے جاسکتے''۔

اس نے پھر ذہن پر زور دیا کہ کوئی اچھا مقام سوجھے مگر ناکام۔ بالآخر اس نے ''A'' استعمال کرنے کے لیے ذہن بنالیا۔ A نامی جگہ پر اس کا مسرور خاندان ہوگا۔

''اس کا مسرور خاندان A میں ہوگا............ اس میں اب کوئی شک نہیں ہونا چاہیے''۔

ظاہر ہے خاندان میں میاں بیوی ہوں گے............ مالک اور مالکن............ جنہوں نے محبت کی شادی کی۔ ان کی شادی میں چالیس مفصل شرائط ہیں۔ اس طرح انہیں غیر معمولی مساوات اور

آزادی حاصل ہے۔ مزید برآں وہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور مہذب ایلیٹ سے تعلق رکھتے ہیں............ جاپان پلٹ سٹوڈنٹس اب کوئی فیشن نہ رہے لہٰذا انہیں مغرب پلٹ سٹوڈنٹس قرار دیا جائے۔ گھر کا مالک ہمیشہ مغربی سوٹ پہنتا ہے۔ اس کا کالر ہمیشہ برف کی طرح سفید رنگ کا ہے۔ اس کی بیوی کے بال سامنے سے چڑیا کے گھونسلے کی طرح اوپر کو مڑے ہوتے ہیں، اس کے موتی جیسے سفید دانت ہمیشہ باہر کی طرف جھانکتے ہیں، مگر وہ چینی لباس پہنتی ہے............''۔

''نہیں یہ کام نہ دے گا۔ پچیس سیر''۔

کھڑکی سے باہر ایک شخص کی آواز سن کر اُس نے اُس طرف دیکھا۔ کھڑکی پر لگے پردوں میں سے سورج کی شعائیں اس کی آنکھوں کو خیرہ کررہی تھیں۔ اس نے آواز سنی جیسے کسی نے لکڑی کا گٹھا زمین پر پھینک دیا ہو۔ ''کوئی بات نہیں'' اس نے سوچا اور دوبارہ لکھنے میں لگ گیا۔ ''25 سیر، کس چیز کے؟''............ وہ مہذب ایلیٹ طبقے سے ہیں، آرٹ کے دلدادہ۔ مگر چونکہ وہ دونوں خوشحال خاندانوں میں پلے بڑھے ہیں، اس لیے وہ روسی ناول پسند نہیں کرتے۔ اکثر روسی ناول نچلے طبقات کو بیان کرتے ہیں اس لیے وہ ایسے خاندان میں نہیں پڑھے جاتے۔ ''25 سیر؟''۔ کوئی بات نہیں۔ اس صورت میں وہ کیسی باتیں پڑھتے ہیں؟............ بائرن کی شاعری؟ کیٹس؟۔ نہیں نہیں۔ اچھا میں بتاتا ہوں۔ وہ دونوں ''ایک مثالی شوہر'' پڑھنا پسند کریں گے۔ گو کہ وہ کتاب میں نے خود نہیں پڑھی، لیکن یونیورسٹی پروفیسر تک اس کتاب کی اتنی تعریفیں کرتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ جوڑا بھی اُس سے محظوظ ہوگا۔ تم اسے پڑھو، میں اسے پڑھوں............ ان دونوں کے پاس الگ الگ کتاب ہوگی۔ خاندان میں بہ یک وقت کتاب کی دو کاپیاں............''۔

اپنے معدے میں خالی پن کے ایک احساس کے ساتھ، اس نے قلم نیچے رکھ دیا اور اپنا سر ہاتھوں میں تھاما۔ جیسے ایک گلوب دو ایکسلوں پر رکھی ہو۔

''............ دونوں دوپہر کا کھانا کھا رہے ہیں''۔ اس نے سوچا ''میز پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ اور باورچی ڈشیں لا رہا ہے............ چائنیز فوڈ............''25 سیر'' کس چیز کے؟ کوئی بات نہیں۔ یہ چائنیز فوڈ کیوں ہو؟ مغربی لوگ کہتے ہیں کہ چائنیز پکانا سب سے زیادہ ترقی پسند

ہوتا ہے، یہ کھانے کے لیے بہترین ہوتا ہے، اور سب سے زیادہ صاف ستھرا۔ اس لیے وہ چائنیز فوڈ کھاتے ہیں۔ پہلی ڈش لائی جاتی ہے، مگر یہ پہلی ڈش کیا ہو؟...........''۔

''جلانے کی لکڑی...........''۔

وہ گردن گھماتا ہے تاکہ اپنے خاندان کی مالکن کو دیکھے کو جو اس کے بائیں جانب کھڑی ہے، اس کی دونوں سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز ہیں۔ کیا؟''۔ اس نے ناراضگی کے انداز میں کہا، گویا بیوی کی آمد نے اس کے لکھنے میں رخنہ ڈالا۔

''جلانے کی لکڑی ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے میں نے آج مزید خریدی ہے۔ پچھلی بار دس سیر کے لیے دو سو چالیس نقد دیے تھے، مگر آج وہ دو سو ساٹھ مانگ رہا ہے۔ میں اسے دو سو پچاس دے دوں؟''۔

''ٹھیک ہے۔ دو سو پچاس دے دو''۔

''اُس نے اسے اچھی طرح نہیں تولا۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ وہ ساڑھے چوبیس سیر ہیں، مگر میں اسے ساڑھے تیئس گنوں تو؟''۔

''ٹھیک ہے۔ اسے ساڑھے تیئس سیر گنو''۔

''پھر پانچ پنجے پچیس، تین پنجے پندرہ...........''۔

''اوہ پانچ پنجے پچیس، تین پنجے پندرہ...........''۔ وہ آگے نہیں جا سکتا تھا، مگر ایک لمحے کو رک کر اس نے اچانک قلم اٹھایا اور لائنوں والے اُس کاغذ پر حساب کتاب لکھا جس پر کہ اس نے لکھا تھا ''ایک مسرور خاندان''۔ اس پر کچھ وقت تک ضرب تقسیم کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا اور کہا:

''پانچ سو اسی نقد''

''اچھا؟ اتنے پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں۔ اسی یا نوے کم پڑیں گے...........''۔

اس نے ڈیسک کا دروازہ کھولا اور اس میں موجود سب پیسے اٹھا لیے...........اور انہیں اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا اور وہ بالآخر واپس اپنے ڈیسک پر متوجہ ہوا۔ اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ تیز انگاروں سے لبالب بھرا ہوا ہو۔ پنج

پنجے پچیس...........اس کے دماغ پر بکھرے ہوئے عربی ہندسے ابھی تک نقش تھے۔ اس نے پھر سوچنا شروع کر دیا:

''کیا ڈش؟ کوئی بات نہیں۔ فرائی سوئر یا مچھلی، مچھلی کے انڈے اور سمندری گھونگے بہت عام ہیں۔ مجھے انہیں ''اژدھا اور چیتا'' کھلانا چاہیے۔ مگر وہ اصل میں ہے کیا؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سانپ اور بلیوں سے بنا ہوا ہے اور یہ بالائی طبقے کی ڈش ہے جسے صرف بڑی ضیافتوں میں کھلایا جاتا ہے۔ میں نے کیا نکسو ریسٹورنٹ کا مینو دیکھا ہے، پھر بھی کیا نکسو کے لوگ سانپ اور بلیاں نہیں کھاتے۔ اس لیے یہ یقیناً مینڈک اور مار ماہی کے بنائے جائیں۔ تو اب یہ جوڑ ملک کے کس حصے کا ہو سکتا ہے؟۔ کوئی بات نہیں۔ بہر حال ملک کے کسی حصے کے لوگ سانپ مینڈک اور مار ماہی کی ڈش کھا سکتے ہیں۔ کسی صورت میں پہلی ڈش ''اژدھا اور چیتے'' ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی اگر مگر نہ ہوگا۔

''اب جبکہ 'اژدھا اور چیتے' کا پیالہ میز کے وسط میں رکھا ہوا ہے، وہ بہ یک وقت اپنے چاپ سٹکس اٹھاتے ہوئے، اپنی توجہ ڈش پہ مرکوز کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی طرف مسکراتے ہیں اور ایک خارجی زبان میں کہتے ہیں:

''چیری سل وَس پلیٹ''

''وولز وہیں کمنسر، چیری''

''میس نان، اپریس وس''۔

''پھر وہ بہ یک وقت اپنے چاپ اٹھاتے ہیں اور بہ یک وقت سانپ کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہیں...........نہیں نہیں۔ سانپ کا گوشت واقعتاً مخصوص آواز دیتا ہے، بہتر ہوگا کہ اسے مار ماہی کا لقمہ کہا جائے۔ اچھا، تو اب یہ فیصلہ ہو چکا کہ 'اژدھا اور چیتا'۔ در اصل مینڈکوں اور مار ماہی سے بنا ہے۔ وہ بہ یک وقت مار ماہی کے دو نوالے نکالتے ہیں، بالکل ایک ہی سائز کے۔ پانچ پنجے پچیس، تین پنجے...........کوئی بات نہیں۔ اور بہ یک وقت اپنے اپنے منہ میں ڈال دیتے ہیں...........''

وہ سوچتا ہے:

''یہ ذرا جذباتی سا لگتا ہے؟ کوئی بھی خاندان اس طرح برتاؤ نہیں کرے گا جو مجھے اس طرح پریشان کرتا ہے؟۔ مجھے ڈر ہے کہ اچھا مضمون کبھی بھی نہیں لکھا جائے گا............ یا شاید انہیں یورپ پلٹ سٹوڈنٹ ہونے کی ضرورت نہیں، چین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے لوگ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ وہ دونوں یونیورسٹی گریجویٹ ہیں، مہذب الیٹ............مرد مصنف ہے عورت بھی مصنف ہے، یا ادب سے محبت کرنے والی ہے۔ یا وہ شاعرہ ہے؛ اور مرد شاعری سے محبت کرتا ہے، عورتوں کی عزت کرنے والا۔ یا............''۔

وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

اس کے پیچھے کتابوں کی الماری کے پاس گوبھیوں کا ایک انبار نظر آیا، تین نیچے، دو اوپر اور ایک چوٹی پر۔ اُسے وہ ایک بڑا A نظر آیا۔

''اوہ'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اسے اپنے گال جلتے ہوئے محسوس ہوئے، اور چھوٹے کیڑے اس کی ریڑھ کی ہڈی کے اوپر نیچے دوڑتے رہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تا کہ ریڑھ کی ہڈی میں کیڑے رینگنے کے احساس سے جان چھڑائے ۔ وہ سوچنے لگا۔'' مسرور خاندان کے گھر میں بہت سارے کمرے ہونے چاہئیں۔ ایک سٹور ہے جس میں گوبھی جیسی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ مالک کا مطالعہ کا کمرہ الگ ہے۔ اس کی دیواروں پر کتابوں کے شیلف لگے ہیں اور ظاہر ہے وہاں گوبھی نہ ہوگی۔ شیلف چینی اور غیر ملکی کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں یقیناً '' ایک مثالی شوہر'' نامی کتاب موجود ہوگی۔ اس کی دو کاپیاں۔ ایک علیحدہ بیڈروم ہے، پیتل کا ایک پلنگ ہے، یا ذرا سا سادہ جیسے کہ نمبر ایک جیل خانے کے قیدیوں کے بنائے ہوئے ہیں۔

''دیودار کے پلنگ ۔ بستر کے نیچے بہت صفائی ....''۔ اس نے خود اپنی چارپائی کے نیچے جھانکا۔ جلنے والی لکڑی ساری ختم ہو چکی ہے، اور وہاں محض ایک رسی پڑی تھی، سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی رسی۔

''ساڑھے تئیس سیر ....''۔ اُسے محسوس ہوا کہ ان کے بستر کے نیچے جلانے والی لکڑی بڑی مقدار میں آئے گی۔ اس کے سر میں پھر درد ہوا۔ وہ اٹھا اور دروازہ بند کرنے کے لیے

تیزی سے وہاں گیا۔ مگر اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ یہ جلد بازی ہوگی۔ اس نے اُسے ایسا ہی رہنے دیا۔ اس نے دروازے کا پردہ گرا دیا۔ جو کہ گرد سے موٹا ہو گیا تھا۔

''........... چنانچہ مالک کا مطالعے کا کمرہ ہمیشہ بند رہتا ہے''۔ وہ واپس بیٹھ گیا اور سوچنے لگا'' جس کو بھی کام ہو وہ پہلے دروازہ کھٹکھٹائے گا، اور اجازت ملنے پر ہی اندر آئے گا۔ اب فرض کر لو مالک مطالعے کے کمرے میں بیٹھا ہے اور مالکن ادب پر گفتگو کرنے آتی ہے، تو وہ بھی دروازہ کھٹکھٹائے گی ....اور کم از کم یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ گوبھی ساتھ نہ لائے گی۔

''لیکن اگر مالک کے پاس ادب پر گفتگو کرنے کے لیے ٹائم نہ ہو تو کیا ہوگا؟''۔ جب وہ باہر کھڑی دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹائے گی تو کیا وہ اسے نظر انداز کرے گا؟۔ شاید ایسا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ'' ایک مثالی شوہر'' میں درج ہو.......... وہ یقیناً بہت اچھا ناول ہوگا۔ اگر مجھے اس مضمون کے پیسے ملے تو میں وہ کتاب خرید لوں گا!''۔

تھپڑ!

اس کی پشت اکڑ جاتی ہے، اس لیے کہ اُسے تجربے سے معلوم ہے کہ تھپڑ کی یہ آواز اس کی بیوی کے ہاتھ کی ہے جس نے اسے اُن کی تین سالہ بیٹی کے سر پر مارا ہوگا۔

''ایک مسرور خاندان میں ....''۔ اس نے سوچا، اس کی پشت ابھی تک اکڑی ہوئی تھی۔ وہ بچی کی سسکیاں سن سکتا تھا۔'' ایک مسرور خاندان میں بچے دیر سے پیدا ہوں گے، دیر سے ۔ یا شاید یہ بہتر ہوگا کہ بچے ہوں ہی نہیں ۔محض دو افراد کسی بھی بندھن کے بغیر .... اور یا شاید یہ بہتر ہو کہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا جائے اور انہی کی دیکھ بحال میں رہا جائے ....ایک اکیلا آدمی بغیر کسی ....''۔ ہچکیوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں، وہ اٹھا اور پردے کے پاس یہ سوچتا ہوا چلا گیا'' کارل مارکس نے'' داس کیپٹل'' اُس وقت لکھا جب اُس کے بچے اس کے اردگرد رو رہے ہوتے تھے۔ وہ واقعی عظیم آدمی تھا...........''۔ وہ باہر نکلا، بیرونی دروازہ کھولا اور پیرافین کی سخت بُو نے اس پر حملہ کر دیا۔ بچی اوندھے منہ دروازے کے دائیں طرف لیٹی تھی۔ جونہی اُس نے اُسے

دیکھاتو زورزور سے رونے لگی۔

’’ارے نہیں بچے، مت رو۔ نہ رو۔تم تو اچھی بچی ہو‘‘۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی دروازے کے بائیں طرف غصے سے بھری کھڑی ہے۔اس کی کمر بھی اکڑی ہوئی تھی ، دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔لگتا تھا ورزش شروع کرنے والی ہو۔

’’تم بھی مجھے ہی خوفزدہ کرتے ہو۔کبھی مدد نہیں کرتے۔تم صرف مشکلات پیدا کرتے ہو.........پیرافین لیمپ بھی گر گیا ہے۔اب ہم شام کو کیا جلائیں گے؟‘‘۔

’’ارے، چپ ہو جا میری بیٹی! ۔بس چپ ہو جاؤ۔ سب ٹھیک ہوگا‘‘۔ اپنی بیوی کی ہانپتی آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بچی کو اٹھایا اور کمرے کے اندر لے گیا۔اس نے اس کا سر تھپتھپایا’’میری اچھی بچی‘‘۔ وہ دھراتا رہا۔ پھر اس نے اسے نیچے رکھا ایک کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ بچی کو اپنے گھٹنوں کے درمیان رکھ کر اپنا ہاتھ بلند کیا۔’’نہ رو، نہ رو میری اچھی بچی‘‘ اس نے کہا’’ ابو تمہارے لیے بلی کی صفائی کا کھیل پیش کرے گا۔ بہ یک وقت اس نے اپنی گردن اونچی کی، دور سے دو دفعہ اپنی ہتھیلی چاٹی، پھر اُن کے ساتھ اپنے چہرے کی طرف دائرے بنائے۔

’’آہا بلی!‘‘ وہ ہنسنے لگی۔اُس نے اور کئی دائرے بنائے اور پھر اُسے اپنی طرف مسکراتے دیکھ کر رک گیا۔آنسو ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھے۔اُسے اچانک لگا کہ اس کا خوبصورت معصوم چہرہ پانچ سال قبل اس کی ماں کے چہرے کی طرح ہے،خصوصاً اس کے گہرے سرخ ہونٹ۔ وہ ایک دھوپ نکلا زمستانی دن تھا جب ماں نے اُس کے منہ سے ساری رکاوٹیں پار کرنے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کا فیصلہ سنا؛ وہ بھی اُس کی طرف اِسی طرح دیکھ رہی تھی، مسکراتے ہوئے، آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ۔ وہ غمزدہ ہو گیا، جیسے نشے میں ہو۔’’آہ۔ پیارے ہونٹ‘‘۔ اس نے سوچا دروازے کا پردہ اچانک پھر بند ہوا اور جلنے والی لکڑی اندر لائی گئی۔

اچانک آپے میں آ کر اس نے دیکھا کہ بچی، جس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو موجود تھے، اس کی طرف اُس کے سرخ ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔’’ہونٹ..........‘‘۔ اس نے اُس طرف

دیکھا جہاں سے جلانے کی لکڑی لائی جارہی تھی۔’’..........شاید یہ کچھ نہ ہو بس پانچ پنجے پچیس، نو نمّے اکیاسی ہوں!..........پھر دوبارہ۔اور دو سیاہ آنکھیں..........‘‘۔ایسا سوچتے ہوئے اس نے سبز لائنوں والا کاغذ جھپٹ لیا جس پر مضمون کی سرخی لکھی تھی اور ہندسے لکھے ہوئے تھے۔اس نے اُسے مٹھی میں مروڑ لیا۔اور پھر دوبارہ کھولا تاکہ بچی کی آنکھیں اور ناک صاف کرے۔’’اچھی بچی، چلو دوڑو اور جا کر کھیلو‘‘۔اس نے یہ کہتے ہوئے اسے دھکیلا ، بہ یک وقت گیند بناتے ہوئے کاغذ کو ردی کی ٹوکری میں اچھال دیا۔

مگر یک دم اسے بچی پر پیار آ گیا،اور گردن موڑتے ہوئے اپنی مغموم آنکھوں سے باہر جاتے ہوئے اُس کا تعاقب کیا، جبکہ اس کے کانوں میں جلنے والی لکڑی کی آوازیں آرہی تھیں۔غور کرنے پہ وہ مصمم انداز میں مڑا اور آنکھیں بند کرلیں تاکہ سارے،توجہ ہٹانے والے خیالات رک جائیں۔وہ وہاں خاموش اور آرام سے بیٹھا رہا۔

اس نے اپنے سامنے ایک نارنگی مرکز والا گول بھورے رنگ کا پھول گزرتے دیکھا جو اس کی بائیں آنکھ کی بائیں جانب سے بالکل الٹی طرف تیرتا جاتا تھا جہاں وہ غائب ہوا پھر گہرے سبز مرکزے والا ایک چمکیلا سبز پھول، اور آخر میں چھ گوبھیوں کا ایک انبار جو اُس کے سامنے ایک بڑا حرف A بنا گئے۔

صابن

ترچھی دھوپ میں شمالی کھڑکی کی طرف پیٹھ کیئے' سُومن کی بیوی اپنی آٹھ سالہ بیٹی سیوارھ کے ساتھ مُردے کے لئے کاغذی نوٹ چپکا رہی تھی جب اس نے کپڑے کے جوتے پہنے کسی کے آہستہ اور بھاری قدموں کی آواز سنی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کا خاوند لوٹ آیا۔ کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے وہ نوٹ چپکانے میں لگی رہی۔ مگر کپڑے کے جوتوں کی آہٹ قریب آتی گئی اور بالآخر اس کے قریب آ کر رک گئی۔ تب وہ نظریں اوپر اٹھائے سُومن کو دیکھے بنا نہ رہ سکی جو کہ اپنے کندھے اچکائے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ چوغے کی جیب سے باہر نکالا جس میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا، جو اس نے اپنی بیوی کو تھما دیا۔ جونہی بیوی نے اسے ہلایا تو اسے ایک غیر مانوس خوش بُو محسوس ہوئی جو زیتون سے ملتی جلتی تھی۔ کاغذ کے سبز پوش پر ایک چمکدار سنہری مہر تھی جس میں چھوٹی ڈیزائنوں کا جال تھا۔ سیوارھ اسے پکڑنے کے لئے آگے جھکی مگر اس کی ماں نے فوراً اسے دوسری طرف دھکیل دیا۔

''شاپنگ کرتے رہے؟''۔ اس نے پیکٹ پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''آں ہاں''۔ خاوند نے اس کے ہاتھ میں تھامے پیکٹ پر دیکھتے ہوئے کہا۔

کاغذ کے سبز رنگ کے پوش کو کھولا گیا۔ اندر ایک بہت ہی باریک کاغذ کی ایک تہہ تھی، وہ بھی سورج مکھی جیسا سبز تھی۔ وہ بھی آخری تہہ نہ تھی۔ اس کے اندر کریم کلر کا ایک کاغذ کسی چیز کو لپیٹے

ہوئے تھا۔ اب زیتون جیسی خوشبو مزید تیز ہو گئی تھی۔

''اوہ، یہ تو واقعتاً ایک اچھا صابن ہے''۔

وہ ایک بچے کی طرف صابن کو ناک کے پاس لے گئی اور اسے سونگھنے لگی۔

''آں............ ہاں۔ اب آئندہ اسے استعمال کرو............''۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ بات کرتے ہوئے اس کی گردن کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی گالوں پہ سرخی محسوس کی۔ جب اس نے اپنی گردن پہ ہاتھ پھیرا؛ بالخصوص کانوں کے پیچھے تو اس کی انگلیوں نے ایک کھردرا پن محسوس کیا؛ اور گو کہ وہ جانتی تھی کہ وہ کئی سالوں کی جمع شدہ میل تھی، مگر اُس نے کبھی اس پر توجہ نہ دی تھی۔ اب شوہر کی تیز نگاہوں کے نیچے تو وہ اپنی گالوں میں سرخی آنے سے نہ روک سکی، بالخصوص جب اس کی نگاہ اِس عجیب سے خوشبو بھرے سبز، غیر ملکی صابن پر پڑی۔ یہ سرخی اس کے کانوں کے سروں تک پھیل گئی۔ اس نے رات کا کھانا کھانے کے بعد اس صابن سے بھرپور غسل کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا۔

'' کچھ جگہیں ایسی ہیں جنہیں محض لوکسٹ نامی درخت کے شیرے سے صاف نہیں کیا جا سکتا''۔ اس نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ماں، یہ میں لے لوں؟''۔ سیوارھ نے سورج مکھی جیسا سبزی مائل کاغذ پکڑتے ہوئے کہا۔ چھوٹی بیٹی چاوارھ جو باہر کھیل رہی تھی دوڑتے ہوئے اندر آئی۔ مسز سُومن نے یک دم دونوں کو ایک طرف دھکیلا، پتلے کاغذ کو تہہ کر کے اپنی جگہ پر رکھا، پہلے کی طرح سبز کاغذ اس پہ لپیٹا اور اسے سب سے اونچی شیلف پر رکھنے کیلئے پنجوں سے بلند ہوئی۔ آخری نظر ڈالنے کے بعد وہ واپس اپنے کاغذ کے نوٹوں کی طرف لوٹی۔

''سُو چنگ''۔ لگتا تھا سُومن کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ اپنی بیوی کے بالمقابل ایک اونچی پشت والی کرسی پر بیٹھے ہوئے زور سے پکارا۔

''سُو چنگ''۔ بیوی نے پکار کر شوہر کی مدد کی۔ جب اس نے دیکھا کہ شوہر منہ موڑے بے چینی سے بیوی کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھ رہا ہے تو بیوی جھینپ سی گئی۔

''سُو چنگ''۔ وہ بلند ترین آواز میں بولی۔

یہ آواز بہت موثر ثابت ہوئی اس لئے کہ انہوں نے چمڑے کے جوتوں کی دھمک قریب ہوتے سنی، اور سُو چنگ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا گول چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا۔

''تم کیا کر رہے تھے؟''۔ خاتون نے ناراضگی سے پوچھا۔ ''تم نے اپنے والد کی آواز کیوں نہ سنی؟''۔

''میں باکسنگ کی پریکٹس کر رہا تھا۔۔'' وہ یک دم باپ کی طرف مڑا اور سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ والد نے اسے کیوں بلایا تھا۔

''سُو چنگ، میں تم سے ''اوڈُوفُو'' کا مطلب پوچھنا چاہتا تھا''۔

''اوڈُوفُو ؟۔۔۔۔۔۔۔۔کیا یہ بہت سخت گیر بیوی نہیں ہے؟''۔

''کیا بدتمیزی ہے ! کیا واہیات خیال ہے !''۔ سُومِن اچانک آپے سے باہر ہو گیا'' کیا میں ایک عورت ہوں، خدا کی پناہ؟''۔

سُو چنگ دو قدم پیچھے ہٹا اور مزید سیدھا کھڑا ہو گیا۔ گو کہ اسے کبھی کبھی اپنے والد کی چال پیکنگ اوپیرا میں بوڑھے آدمی جیسے لگتی تھی، مگر اُس نے سُومِن کو کبھی بھی ایک عورت نہیں سمجھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا جواب بہت بڑی غلطی تھی۔

''جیسے کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ اوڈوفو کا مطلب ایک بہت ہی درشت بیوی ہے، اور اس لیے مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت پڑ گئی ہے؟۔۔۔۔۔۔ یہ چینی زبان کا لفظ نہیں ہے، یہ خارجی شیطانوں کی زبان ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''۔

''مجھے۔۔۔۔ معلوم نہیں''۔ سُو چنگ مزید بے چین ہو گیا۔

''اوہ۔ اگر تمہیں اتنی معمولی بات کا بھی پتہ نہیں تو میں نے تمہیں سکول بھیج کر سارا پیسہ کیوں برباد کر ڈالا؟۔ تمہارا سکول تو شیخی بگھارتا ہے کہ وہ بول چال اور سمجھنے دونوں پر یکساں زور دیتا ہے، مگر اس نے تو تمہیں کچھ بھی نہیں پڑھایا۔ وہ سارے لوگ جو یہ شیطانی زبان بولتے ہیں ان کی عمریں چودہ پندرہ برس سے زائد نہیں ہیں، بلکہ وہ تم سے چھوٹے ہیں، لیکن پھر بھی وہ اسے فر فر بول

رہے تھے جبکہ تمہیں ایک لفظ کے مطلب تک نہیں آتے۔ اور تم بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیتے ہو مجھے نہیں معلوم۔ جاؤ اور ابھی اس کے معانی میرے لئے ڈھونڈ نکالو، فوراً''۔

''جی اچھا''۔ سُو چنگ نے دل کی گہرائی سے کہا اور احترام سے چلا گیا۔

''پتہ نہیں یہ آجکل کے طالب علم کیا کرتے رہتے ہیں''۔ سُومِن نے ایک وقفے کے بعد جذباتی انداز میں کہا''۔ اصل میں کوانگ سُو کے دور (1875۔۔۔1908) میں، میں سکول کھولنے کا بہت شوقین تھا؛ مگر میں نے یہ پیش بینی کبھی نہ کی کہ یہ اس قدر بڑی برائی ہو کر نکلے گی۔ ہم نے کیا ''نجات'' اور ''آزادی'' حاصل کی۔ کوئی اصلی تعلیم نہیں ہے، بس سب بکواس ہے۔ میں نے سُو چنگ پر اچھی خاصی رقم خرچ کی، سب کچھ بے کار گیا، اسے اس نیم مغربی اور نیم چینی سکول میں ڈالنا آسان نہ تھا جہاں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ''انگلش بولنے اور سمجھنے'' پر بہت زور دیتے ہیں۔ آپ سوچتے ہیں کہ سارے سکول اچھے ہوں گے۔ ارے نہیں ایک پورا سال گزارنے کے بعد بھی اسے کچھ نہیں آتا۔ وہ ابھی تک مردہ کتابیں پڑھتا رہا ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں ایسے سکول کا کیا فائدہ؟ ۔ میں تو کہتا ہوں ان سارے سکولوں کو بند کر دینا چاہیے''۔

''ہاں۔ ساروں کو بند کر دینا چاہیے''۔ اس کی بیوی نے ہمدردی سے ہاں میں ہاں ملائی۔

''سیوارھ اور اس کی بہن کو کسی سکول میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جیسے کہ دادا نے کہا تھا، لڑکیوں کو پڑھانے کا کیا فائدہ؟ جب اس نے لڑکیوں کے سکولوں کی مخالفت کی تھی تو میں نے اُس کی بہت مخالفت کی تھی۔ مگر اب دیکھتا ہوں تو بڑے بوڑھے ٹھیک کہتے تھے۔ ذرا سوچو۔ ویسے بھی عورتوں کا گلیوں میں گھومنا پھرنا کتنا برا لگتا ہے، اور اب تو وہ اپنے بال بھی چھوٹے کرنا چاہتی ہیں ۔ مجھے تو چھوٹے بالوں والی اِن سکول لڑکیوں کو دیکھ کر کراہت ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں؛ سپاہیوں اور ڈاکوؤں کے لئے تو کچھ نہ کچھ بہانہ ہے، مگر یہ لڑکیاں تو ہر چیز کو الٹ پلٹ دیتی ہیں۔ اُن پر تو خوب سختی کرنے کی ضرورت ہے............''۔

''ہاں۔ ابھی تک تو سارے مرد سر منڈوائے بدھ بھکشو لگتے تھے۔ اور اب عورتیں سر منڈ

وائی مسیحی راہباؤں کی نقل اتار رہی ہیں''۔

''سُو چنگ!''۔

سوچنگ تیزی سے ایک چھوٹی، موٹی کتاب لیے آیا اور اسے باپ کے حوالے کردیا۔

سُومِن نے اسے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک ڈکشنری ہے مگر اس کے الفاظ بہت باریک تھے۔ ماتھے پر بل دیتا ہوا وہ کھڑکی کی طرف مڑا اور آنکھیں سکیڑتا ہوا پڑھنے لگا۔

''اٹھارویں صدی میں امداد باہمی کے لئے قائم کردہ ایک سوسائٹی۔ ارے نہیں' ایسا نہیں ہوسکتا''۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ ایک برا لفظ ہے۔ ایک طرح کا گندا لفظ۔ مجھ جیسے کسی کو گالی کے لئے استعمال ہونے والا لفظ۔ سمجھے؟ جاؤ ڈھونڈ کر دیکھو''۔

سوچنگ کئی بار اسے دیکھتا رہا، مگر ہلا نہیں۔

''کتنا کنفیوز کرنے والا ہے۔ نہ سر کا پتہ نہ دم کا۔ ارے، پہلے تو چیزیں وضاحت کے ساتھ بیان کرو تبھی وہ اسے ڈھونڈ نکالے گا''۔ ماں نے بیٹے کو مخمصے میں دیکھتے ہوئے اس کی طرف داری میں شوہر سے کہا۔

خاوند نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا: ''یہ اس وقت ہوا جب میں بازار میں صابن خرید رہا تھا۔ وہاں تین طالب علم بھی خریداری کررہے تھے۔ ظاہر ہے میں انہیں ذرا سا محتاط لگ رہا ہوں گا۔ میں نے صابن کے چھ سات نمونے دیکھے اور انہیں مسترد کیا۔ جو سب کے سب چالیس سنٹ قیمت کے تھے۔ پھر میں نے ایک صابن دیکھا جس کی قیمت دس سنٹ تھی۔ پھر میں نے یہ والا سبز صابن چوبیس سنٹ میں خرید لیا۔ دکاندار انہی مغرور نوجوانوں میں سے تھا جن کی آنکھیں سر پر ہوتی ہیں۔ اس نے کتے جیسی شکل بنائی۔ اس پہ ان طالب علموں نے ایک دوسرے کو آنکھ ماری اور شیطانی (انگلش) زبان بولنے لگے۔ میں پیسے دینے سے پہلے کاغذ اتار کر صابن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے کیا پتہ تھا کہ غیر ملکی کاغذ چڑھا ہوا یہ صابن اچھا تھا یا برا؟ مگر اس نوجوان نے ایسا کرنے سے منع کردیا۔ وہ نامناسب رویے سے پیش آیا اور کچھ برے جملے کہے جن پہ وہ تضحیک

کرنے والے بدتمیز ہنس پڑے۔ سب سے چھوٹے والے نے مجھ پر نظریں گاڑتے ہوئے وہ والا لفظ کہا۔ اور دوسرے ہنسنے لگے۔ لہٰذا یقیناً یہ کوئی برا لفظ ہوگا''۔ وہ سوچنگ کی طرف مڑا۔ ''اسے ''بری زبان'' والے سیکشن میں ڈھونڈو''۔

''جی اچھا''۔ سُوچنگ نے احترام سے کہا اور چلا گیا۔

''اور ابھی تک وہ ''نیا کلچر، نیا کلچر'' چلاتے رہتے ہیں۔ طالب علموں کا کوئی اخلاق نہیں، سماج کا کوئی اخلاق نہیں۔ جب تک ہم اس کا کوئی علاج ڈھونڈیں گے، چین تو ختم ہوجائے گا۔ وہ کس قدر قابلِ ترس تھی............''۔

''کون؟'' بیوی نے پوچھا۔

''وہ لڑکی............''۔ اس کی آواز میں احترام تھا۔ ''بازار میں دو بھکارنیں تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی تھی، اٹھارہ انیس برس کی۔ اصل میں اس عمر میں بھیک مانگنا بہت نامناسب ہے۔ مگر وہ بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ ایک ستر سالہ عورت کے ساتھ تھی جس کے سفید بال تھے اور وہ اندھی تھی۔ وہ اس کی دادی تھی۔ جو کچھ حقیر چیز لڑکی کو ملتی، وہ اسے دادی کے حوالے کرتی، خود بھوکی رہتی۔ مگر تمہارا کیا خیال ہے لوگ حتیٰ کہ ایسی ایک لڑکی کو خیرات دیں گے؟''۔

اس نے بیوی پر نگاہیں مرکوز کیں، جیسے اس کی ذہانت کا امتحان لے رہا ہو۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا مگر نگاہیں خاوند پر مرکوز رکھیں، جیسے اس سے وضاحت کرنے کا انتظار کررہی ہو۔ ''ارے............نہیں' بالآخر اس نے خود ہی جواب مہیا کردیا ''میں کافی وقت تک دیکھتا رہا اور صرف ایک شخص کو اسے ایک پیسہ دیتے دیکھا۔ بہت سے دوسرے آس پاس جمع ہوئے مگر صرف ان کا مذاق اڑانے۔ وہاں دو کمتر قسم کے بھی تھے جن میں سے ایک نے کہا:

''آہ، فا۔ اس حسن کے ٹکڑے پر پڑے گرد سے مایوس مت ہوجانا۔ اگر تم دو صابن خریدو، اور اُن سے اسے رگڑ رگڑ کر دھوؤ، تو نتیجہ برا بالکل نہیں ہوگا''۔ سوچو، بات کرنے کا کیا طریقہ ہے!''۔

بیوی نے نتھنے پھلائے اور اپنا سر جھکایا۔ کافی وقت کے بعد اس نے پوچھا'' کیا تم نے

اسے خیرات دی؟''۔

''میں نے؟ نہیں۔ مجھے محض ایک دو سکہ دینے سے شرم آئی۔ وہ ایک عام بھکارن نہ تھی............''۔

''ہم م''۔ اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر وہ آہستہ سے اٹھی اور باورچی خانہ چلی گئی۔ شام ڈھل رہی تھی اور یہ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔

سُومن بھی کھڑا ہو گیا اور احاطے تک گیا۔ باہر روشنی زیادہ تھی۔ سوچنگ دیوار کے ایک کونے میں باکسنگ کی پریکٹس کر رہا تھا۔ یہ اس کے ''ہوم ورک'' میں شامل تھا اور اس نے اس مقصد کے لئے دن اور رات کے درمیان کے گھنٹے کو استعمال کر کے کم خرچ طریقہ استعمال کیا۔ سوچنگ تقریباً چھ ماہ سے باکسنگ کر رہا تھا۔ سومن نے بہت آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اپنے ہاتھ پشت پہ باندھے صحن میں ٹہلنے لگا۔ سدا بہار کے واحد درخت کو تاریکی نے نگل لیا اور سفید بادلوں میں ستارے ٹمٹا رہے تھے، بادل جیسے پھٹی ہوئے سفید کپاس کے گالے ہوں۔ رات ہو گئی تھی، سُومن اپنے بڑھتے ہوئے غصے کو دبا نہیں سکا تھا۔ اس نے عظیم کارنامے دکھانے کی طلب محسوس کی، تمام برے طالب علموں اور اس مکار معاشرے کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا چاہا۔ وہ رفتہ رفتہ بے باک ہوتا گیا، اس کے قدم طویل سے طویل تر ہوتے گئے اور اس کے کپڑے والے جوتوں کی آواز بلند تر ہوتی چلی گئی۔ جس سے کہ مرغی اور اس کے چوزے جاگ گئے اور خطرے میں چوں چوں کرنے لگے۔

ہال میں ایک روشنی نمودار ہوئی............ یہ گویا اشارہ ہے کہ کھانا تیار ہے............ اور سارا گھرانہ میز کے گرد جمع ہو گیا۔ سُومن میز کے کونے میں بیٹھ گیا۔ اس کا موٹا گول چہرہ سوچنگ جیسا تھا۔ سبزی کے شوربہ سے گرم بخارات دیکھ کر وہ مندروں میں موجود ''دولت کے دیوتا'' جیسا نظر آ رہا تھا۔ بائیں جانب مسز سُومن اور چاؤ ارھ بیٹھ گئیں، دائیں طرف سُو چنگ اور سُو ارھ۔ چاپ سٹکس پیالوں کے خلاف بارش کی طرح ٹپ ٹپ کی آوازیں پیدا کرنے لگے۔ گو کہ کوئی ایک لفظ بھی نہ بولا۔

چاؤ ارھ نے اپنا پیالہ گرا دیا جس سے شوربہ میز کے نصف حصے تک پھیل گیا۔ سُومن نے اپنی تنگ آنکھیں ممکنہ حد تک وسیع کھول دیں۔ جب اُس نے دیکھا کہ وہ رونے والی ہے تو اس نے اسے گھورنا چھوڑ دیا اور گوبھی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھ کر اپنی چاپ سٹک سے اٹھانی چاہی۔ مگر چھوٹا سا ٹکڑا غائب ہو چکا تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا، اور دیکھا کہ سوچنگ اسے اپنے کھولے ہوئے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔ غصے میں سُومن نے اس کے بجائے منہ بھر زردی مائل پتے کھا لیے۔

''سُوچنگ''۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا ''تم نے وہ لفظ دیکھا یا نہیں؟''۔

''کونسا لفظ؟............ نہیں، ابھی نہیں''۔

''اوہ۔ اس کو ذرا دیکھو تو۔ تم اچھے طالب علم نہیں ہو، نہ ہی تمہیں کسی چیز کا پتہ ہے۔ تم صرف ایک کام کر سکتے ہو، بس کھاتے ہی رہنا۔ تمہیں اُس لڑکی سے سیکھنا چاہیے۔ گو کہ وہ ایک بھکارن ہے مگر پھر بھی وہ اپنی دادی سے عزت سے پیش آتی ہے، خواہ اسے بھوکا ہی رہنا پڑے۔ مگر تم غیر سنجیدہ سٹوڈنٹس کو ایسی باتوں کی کیا خبر؟ تم لوگ تو بس موٹے ہوتے جاتے ہو۔۔۔''

''میں نے ایک امکان کا اندازہ لگایا ہے، مگر پتہ نہیں کہ صحیح ہے یا نہیں۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ شاید انہوں نے اوڈوفو لا کہا ہو گا۔ (چینی لفظ جس کا مطلب ہے، احمق بڈھا)''

''ہاں ہاں، بالکل یہی۔ بالکل ایسا ہی کہا تھا۔ تو اِس کا مطلب کیا ہے؟۔ کیا تمہارا تعلق بھی اسی گروپ سے ہے؟ تم کیسے جانتے ہو؟ تم سب ایک جیسے برے لوگ ہو''۔

مسز سُومن اچانک پھٹ پڑی۔ ''آپ آج کیوں غصے میں آ رہے ہو؟ کھانے پر بھی کتوں پر اشارہ کرتے ہوئے مرغیاں مار رہے ہو۔ اُس عمر کے لڑکے کیا سمجھتے ہیں؟''۔

''کیا؟''۔ سُومن واپس جواب دینا چاہتا تھا مگر اس نے دیکھا کہ غصے سے اس کی بیوی کی آنکھیں دھنس چکی تھیں، غصے سے گال سرخ تھے اور چہرے سے خوفناک روشنی کوندر ہی تھی۔ اس نے فوراً لہجہ بدل دیا ''میں غصے میں نہیں آ رہا۔ میں تو سُو چنگ کو بتا رہا ہوں کہ کچھ مزید سیکھے''۔

''اس کو کیا پتہ کہ آپ کے دماغ میں کیا ہے؟''۔ وہ سخت غصے میں تھی ''اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ کب کا ایک لالٹین یا ٹارچ جلا چکا ہوتا اور اُس لڑکی کو لے آنے باہر جا چکا ہوتا۔

تم پہلے ہی اس کے لئے ایک صابن خرید چکے ہو؛ بس اب ایک اور خریدو۔۔۔۔۔''

''بکواس''۔

''مجھے یقین ہے۔اگر تم ایک اور صابن خریدو اور اُس کو خوب رگڑ رگڑ کر نہلاؤ، پھر اس کی پرستش کرو، تو ساری دنیا پرسکون ہو جائے گی''۔

''تم ایسی باتیں کیسے کرتی ہو؟۔اس میں کیا ربط ہے؟۔کیونکہ مجھے یاد تھا کہ تمہارے پاس صابن نہیں تھا۔۔۔۔۔''

''چلو کوئی ربط ہے۔تم خصوصی طور پر اس لڑکی کے لئے لائے ہو، تو جاؤ اور اُسے اچھی طرح رگڑ رگڑ کر نہلا دو۔میں اس کی مستحق نہیں۔مجھے یہ نہیں چاہیے۔میں اس کی شان میں حصہ دار نہیں بننا چاہتی''۔

''ارے، تم یہ کیا بول رہی ہو؟'' سُومن منمنایا ''تم عورتیں۔۔۔۔۔'' اُس کا چہرہ پسینے سے اس طرح شرابور ہوا، جیسے سُو چنگ باکسنگ کر کے آیا ہو۔

''کیا ہوا ہم عورتوں کو؟۔ہم عورتیں تم لوگوں سے بہت بہتر ہیں۔اگر تم مرد لوگ اٹھارہ انیس سالہ گرلز سٹوڈنٹس کو کوس نہیں رہے ہوتے ہو، تو تم اٹھارہ انیس سالہ بھکارن کی تعریف کر رہے ہوتے ہو؛ تم لوگوں کی کتنی گندی ذہنیت ہوتی ہے۔رگڑ کر نہلانا۔۔۔۔۔کراہت آتی ہے!''

''سُومن!''۔باہر اندھیرے میں ایک گرجتی ہوئی آواز نے پکارا۔

''تاؤ تنگ یہ تم ہو؟۔ابھی آیا''۔

سُومن جانتا تھا کہ وہ تاؤ تنگ ہے جس کی بھاری آواز اُس کی شناخت ہے۔وہ مسرت سے یوں پکار اٹھا جیسے کسی مجرم کی سزائے موت ابھی ابھی ملتوی ہوئی ہو۔

'سُو چنگ جلدی کرو، ایک لیمپ جلاؤ اور انکل کو لائبریری میں بٹھاؤ''۔

سُو چنگ نے ایک موم بتی جلائی اور تاؤ تنگ کو مغربی کمرے لے گیا۔ان کے پیچھے پیچھے پُو وی یو آن تھا۔

سُومن کا منہ ابھی تک چاول سے بھرا تھا۔اس نے اُن سے ہاتھ ملایا ''آپ ہمارے

سادہ سے کھانے میں شامل نہ ہوں گے۔۔۔؟''

''ہم کھا کے آئے ہیں'' وی یو آن نے کہا ''ہم اس لئے جلدی جلدی یہاں آئے ہیں کہ لٹریری لیگ کی طرف سے مضمون نویسی اور شاعری کا مقابلہ ہونے والا ہے''۔

''ارے، آج سولہ تاریخ ہے؟''۔سُومن نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھ لو، تم کتنے غیر حاضر دماغ ہو!''۔تاؤ تنگ نے کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں آج رات کچھ نہ کچھ اخبار کے دفتر تک پہنچانا چاہیے۔ تا کہ کل کے اخبار میں یقینی طور پر چھپ جائے''۔

''میں نے مضمون کا عنوان پہلے ہی لکھا ہے۔بس آپ دیکھیں کہ مناسب ہے یا نہیں''۔ اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اُس کی طرف بڑھا دیا۔

سُومن موم بتی کی طرف چلا گیا، کاغذ کھولا اور اسے لفظ بہ لفظ پڑھا: ''ہم پوری قوم سے ایک مضمون کی درخواست کرتے ہیں جس میں صدر سے التجا کی جائے کہ وہ کنفیوشس کے کلاسیک کے فروغ کی خاطر ایک حکمنامہ جاری فرمائے''۔

''بہت اچھا، بہت اچھا.........مگر کیا یہ ذرا زیادہ لمبا نہیں ہے؟''۔

''وہ کوئی مسئلہ نہیں''۔تاؤ تنگ نے زور سے کہا ''میں نے اس پر کام کیا ہے۔اور اسے مشتہر کرنے میں بھی کوئی خاص خرچہ نہیں لگے گا۔مگر نظم کا موضوع کیا رکھیں؟''۔

''نظم کا موضوع؟''۔سُومن اچانک بہت معزز لگا ''بھکارن لڑکی کیسا موضوع ہے؟۔یہ ایک سچی کہانی ہے اور لڑکی تعریف کی مستحق ہے۔آج مین روڈ پر.........''۔

''ارے نہیں، یہ اچھا نہیں ہوگا''۔وی یو آن تیزی سے بولا ''میں نے بھی اُسے دیکھا۔ وہ اِن علاقوں کی نہیں ہے اور میں اس کا لہجہ بھی نہیں سمجھ سکا، نہ وہ میرا لہجہ سمجھی۔مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں کی ہے۔جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ شاعری کرتی ہے تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ اگر وہ کر سکتی تو ٹھیک ہوتا''۔

''مگر پھر بھی اُس کی وفاداری بہت اہم ہے، اگر وہ شاعری نہیں کر سکتی تو کیا

ہوا...........''۔

''یہ سچ نہیں ہے، بات اس کے الٹ ہے''۔وی یو آن نے ہاتھ کھڑا کیا''وہ تبھی دلچسپ بن سکتی ہے اگر وہ شاعری کرتی''۔

''آؤ یہی عنوان کردیتے ہیں''۔سُومن نے کہا''اس میں ایک وضاحت شامل کر کے چھاپ دو۔پہلی بات یہ ہے کہ وہ اس تعریف کی مستحق ہے، دوسری یہ کہ، ہم اسے استعمال کر کے سماج پر تنقید کرسکیں گے۔ میں کچھ وقت تک دیکھتا رہا کسی نے اُسے ایک پیسہ بھی نہیں دیا...........لوگ مکمل طور پر سنگدل ہو چکے ہیں...........''۔

''ارے سُومن۔ میں نے بھی اُسے کچھ نہ دیا اس لئے کہ میرے پاس پیسے نہ تھے''۔وی یو آن بولا۔

''ارے اس قدر حساس نہ بنو''۔سُومن نے کہا۔''بلاشبہ آپ ایک استثنا ہیں۔ مجھے بات پوری کرنے دو۔اس کے گرد اچھا خاصا مجمع جمع تھا۔ بالکل احترام سے مبرا، وہ محض اس پر آوازے کس کر رہے تھے۔وہاں دو کمینے بھی تھے۔ایک نے دوسرے سے کہا''اگر تم دو صابن خرید واور اسے رگڑ کر نہلا دو تو نتیجہ بالکل برا نہیں ہوا۔ ذرا سوچو...........''۔

''ہاہاہا، دو صابن؟''۔تاؤ تانگ اس قدر زور سے ہنسا کہ کانوں کے پردے پھٹتے تھے۔''صابن خریدو،ہاہاہا!''۔

''تاؤ تنگ، تاؤ تنگ، اتنا شور نہ مچاؤ''۔سُومن خوفزدہ ہو کر اسے کہنے لگا۔

''اچھی طرح رگڑ کر نہلانا'ہاہاہا''۔

''تاؤ تنگ!''۔سُومن غصے میں بولا''ہم سنجیدہ بات پر بحث کر رہے ہیں۔تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو۔سنو۔ہم یہ دونوں عنوانات استعمال کریں گے۔سیدھا اخبار کے دفتر روانہ کر دو تا کہ وہ کل صبح ہر صورت چھپ جائیں۔ یہ کام تم دونوں کے ذمے''۔

''اچھا،ٹھیک ہے''۔وی یو آن فوراً رضا مند ہو گیا۔

''ہاہا۔رگڑ کر نہلانا، ہو ہو ہو''۔

''تاؤ تنگ''۔سُومن غصے سے چیخا۔

اس چیخ نے تاؤ تنگ کا قہقہہ بند کر دیا۔ وضاحتیں لکھنے کے بعد وی یو آن نے اسے کاغذ پر نقل کیا اور تاؤ تنگ کے ساتھ اخبار کے دفتر کی طرف چلا گیا۔سُومن موم بتی لیے دروازے تک اُن کے ساتھ گیا۔واپس وسطی میز کے اوپر اس کی نظر صابن کے چھوٹے، سبز، پیکٹ پر پڑی اور اُس پر روشنی میں سنہرے حروف چمک رہے تھے۔

سُو ارہ اور چاؤ ارہ فرش پر کھیل رہے تھے جبکہ سو چنگ بیٹھا ڈکشنری میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔آخر میں روشنی سے دور کونے میں ایک لمبی کرسی پر اُس کی بیوی بیٹھی تھی۔اس کا متاثر کرنے والا چہرہ نہ تو خوشی دکھا رہا تھا اور نہ غصہ۔

''صابن سے رگڑ کر اچھی طرح نہلانا۔کراہت!''۔

مدھم سی آواز میں سُومن نے سُو ارہ کی آواز اپنے پیچھے سنی۔ وہ مڑا مگر وہ نہ ہلی۔صرف چاؤ ارہ نے دونوں چھوٹے ہاتھ اس کے چہرے پر رکھے، جیسے اُسے شرم دلا رہا ہو۔

اس کے لئے جگہ نہ تھی۔اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور چہل قدمی کرنے احاطے میں چلا گیا۔کیونکہ اسے خاموش رہنا بھول گیا تھا اس لئے مرغی اور اس کے چوزے آوازیں نکالنے لگے۔وہ یک دم آہستہ چلنے لگا اور اُن سے دور ہو گیا۔کافی وقت کے بعد ہال میں جلنے والا لیمپ بیڈ روم منتقل ہو گیا۔

وہ بالکل بھی افسردہ نہیں ہوا، جیسے کہ بھکارن لڑکی کی طرح''مکمل طور پر سُونا اور تنہا'' ہو

اُس رات وہ بہت دیر تک نہ سویا۔

اگلی صبح البتہ، صابن کو استعمال کر کے اعزاز بخشا جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی بہ نسبت دیر سے جاگا تو اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جو کہ واش بیسن پر جھکی ہوئی اپنی گردن رگڑ کر صاف کر رہی تھی اور جھاگ دونوں کانوں پر پھیلی ہوئی تھی۔اس جھاگ، اور جو جھاگ درخت کے چھال سے سفید بلبلوں کی صورت پیدا ہوتی ہے' میں وہی فرق تھا جو زمین اور آسمان میں ہوتا ہے۔اس کے بعد زیتون کی ایک بہت ہی سوندھی خوشبو مسز سُومن سے آتی رہی۔

طلاق

’’آہ، انکل مُو۔ نیا سال مبارک، خدا آپ کی قسمت اچھی کرے‘‘۔

’’کیسے حال ہیں، پاسان؟ نیا سال مبارک ہو............‘‘۔

’’ارے آئی کُو بھی یہاں ہیں............

’’سلام دادامُو ....‘‘

جس وقت چوانگ موسان اوراس کی بیٹی آئی کُو میگنو لیاپُل سے کشتی میں بیٹھ گئے تو کشتی میں بیٹھے لوگوں کی بات چیت جاری تھی۔ کچھ مسافروں نے اپنے ہاتھ جوڑے اور جھک کرانہیں سلام کیااور کیبن کے بنچوں پر چار جگہیں خالی کی گئیں۔سلام دعا لینے کے بعد چوانگ مُوسان اپنا لمبا حقہ کشتی کے پہلو میں رکھ کر بیٹھ گیا۔آئی کُو پاسان کے بائیں مقابل بیٹھ گئی۔

’’شہر جارہے ہیں دادامُو؟‘‘ کیکڑے جیسے سرخ چہرے والے آدمی نے پوچھا۔

’’نہیں، شہر نہیں‘‘ دادامُو نے کہا۔اس کا گہرا سرخ چہرہ بہت جُھری دار تھا۔’’ہم پانگ گاؤں جارہے ہیں‘‘۔

کشتی پر بیٹھے سب لوگ باتیں بند کر کے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

’’کیا پھر آئی کُو والا معاملہ ہے؟‘‘ پاسان نے بالآخر پوچھ لیا۔

’’ہاں............ یہ معاملہ مجھے مار دے گا۔ یہ تین سال تک گھسٹتا رہا۔ہم نے بار بار اس پہ جھگڑے کیے اور بار بار صلح کی مگر ابھی تک مسئلہ حل نہ ہوا............‘‘

’’کیا آپ پھر مسٹروی کے گھر جائیں گے؟‘‘۔

’’ہاں۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ وہ ثالث بنا ہے۔مگر میں اس کے شرائط پر کبھی رضا مند نہ ہوا۔اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔اب ان کا خاندان نئے سال کے موقع پر اکٹھے ہو رہا ہے۔حتیٰ کہ شہر سے ’’ساتواں مالک‘‘ بھی وہاں ہوگا............‘‘۔

’’ساتواں مالک؟‘‘ پاسان کی آنکھیں پھیل گئیں‘‘۔تو وہ بھی اپنی رائے دینے موجود ہوگا؟............ ہوں............اصل میں پچھلے سال ہم نے ان کا باورچی خانہ تہہ و بالا کر کے کم و بیش اپنا انتقام لے لیا تھا۔اور پھر آئی کُو کو دوبارہ وہاں جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے............‘‘۔

’’بھائی پاسان میں وہاں دوبارہ جانے کو تیار نہ تھی‘‘۔آئی کُو نے حقارت سے اوپر دیکھا۔’’میں ایسا اُن کو زِچ کرنے کے لئے کر رہی ہوں۔ ذرا سوچو۔نوجوان وحشی نے میرے ساتھ برا برسلوک کیا اور فیصلہ کیا کہ وہ مجھے نہیں چاہتا۔مگر کیا، اتنی سادہ بات ہے؟۔ بوڑھے وحشی نے اپنے بیٹے کی طرفداری کی اور مجھ سے جان چھڑانی چاہی............ جیسے یہ سب کچھ اتنا سادہ ہوا! ساتویں مالک کا کیا؟ وہ مجسٹریٹ کا امتحان پاس کر کے آیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ ہماری زبان نہیں بولتا؟۔ وہ مسٹروی کی طرح کا کوڑھ مغز نہیں ہے جو اس کے سوا کچھ نہیں بولے گا کہ ’’علیحدہ ہو جاؤ، بہتر ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ‘‘۔ میں اسے بتادوں گی کہ ان سارے برسوں میں مجھ پر کیا بیتی، اور ہم دیکھیں گے کہ وہ کسے درست کہے گا!‘‘۔

پاسان قائل ہو گیا اور اپنا منہ بند کر دیا۔

کشتی بہت خاموش تھی۔اور سوائے پانی کی لہروں کے اس پر لگنے کے‘ کوئی اور آواز نہیں آرہی تھی۔ چوانگ موسان نے اپنا حقہ کھینچا اور اس میں تمبا کو بھر لی۔

سامنے پاسان کے ساتھ بیٹھے ایک موٹے آدمی نے اپنے نیفے میں سے چقماق نکال کر چوانگ مُوسان کا حقہ جلایا۔

’’شکریہ شکریہ‘‘۔چوانگ موسان نے اس کی طرف گردن جھکا جھکا کر کہا۔

’’گو کہ ہم پہلی بار مل رہے ہیں‘‘ موٹے آدمی نے تکریم سے کہا’’مگر میں نے آپ کے

بارے میں بہت عرصے سے سن رکھا ہے۔ساحل کے ساتھ ساتھ سارے اٹھارہ گاؤں میں کون ہوگا جوانکل مُوکونہیں جانتا؟۔ہم کافی عرصے سے یہ بھی جانتے ہیں کہ نوجوان شِیھ ایک بیچاری بیوہ کے ساتھ براسلوک کررہا تھا۔جب آپ نے پچھلے سال اس کا باورچی خانہ اتھل پتھل کرنے اپنے چھ بیٹوں کوساتھ لیا تھا' تو کس نے آپ کوحق بجانب نہیں کہا؟..........سارے بڑے دروازے آپ کے لئے کھلے ہیں..........اُن سے کیا خوفزدہ ہوا جائے..........''۔

''یہ انکل واقعی ایک فہمیدہ شخص ہیں''۔آئی کو نے پسندیدگی سے کہا۔''گوکہ میں انہیں جانتی نہیں''۔

''میرانام وانگ ٹی کوئی ہے''۔موٹے شخص نے جواب دیا۔

''وہ مجھے آسانی سے دھکا دے کر باہر نہیں نکال سکتے ۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ وہ ساتواں مالک ہے یا آٹھواں ۔ میں اُس وقت تک مسائل پیدا کرتی رہوں گی جب تک کہ ان کا خاندان تباہ نہ ہوجائے اور وہ سب مرنہ جائیں۔مسٹروی مجھ پر چار دفعہ حملہ آور ہوا۔حتیٰ کہ والد بھی اس مصالحتی پیسہ کے سامنے لڑکھڑا گیا تھا..........''۔

''لیکن دادامُو، کیا شیہہ خاندان نے پچھلے سال کے اواخر میں مسٹروی کوایک پرتکلف دعوت کے کھانے نہیں بھیجے تھے؟''۔کیکڑے جیسے چہرے والے نے پوچھا۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا'' وانگ ٹی کوئی نے کہا''کیا ایک عمدہ دعوت کسی شخص کومکمل طور پراندھا کرسکتی ہے؟۔جوسکالرحقیقت جانتے ہیں ہمیشہ انصاف سے جڑے رہتے ہیں۔مثلاً اگر ایک شخص دوسروں سے ہروقت لڑائی جھگڑا کرتا پھرے تو وہ کھڑے ہوں گے اور اس کے خلاف بولیں گے خواہ انہیں شراب ملے یا نہ ملے۔پچھلے سال کے آخر میں ہمارے پاک گاؤں کے مسٹر ینگ' پیکنگ سے واپس آئے۔ وہ ہم دیہاتیوں کی طرح نہیں ہیں، انہوں نے توعظیم دنیا دیکھی ہے۔انہوں نے کہا کہ وہاں ایک بیگم کوآ نگ، جوکہ بہترین..........''۔

''وانگ جیٹی!''۔کشتی بان نے گاؤں کے نزدیک آنے پرپکارا''وانگ جیٹی کی کوئی سواری ہے؟''۔

''ہاں، میں ہوں''۔موٹے نے اپنا حقہ پکڑا اور کیبن سے باہر نکلا اور جونہی کشتی ساحل پر رکی وہ چھلانگ لگا کراتر گیا۔

''معاف فرمایئے''۔اس نے مسافروں کی طرف سرہلاتے ہوئے کہا۔

کشتی ایک اورخاموشی میں پھرروانہ ہوئی جسے صرف پانی کی لہریں توڑتی تھیں۔ پاسان کونیند آرہی تھی اوراس کا منہ اچھا خاصا کھلا تھا۔اگلی کیبن میں بیٹھی دو بوڑھی عورتیں منہ ہی منہ میں بدھ مت کی آیتوں کا ورد کرتی ہیں اوراپنی تسبیحیں پڑھتی ہیں۔وہ آئی کُو کی طرف دیکھتی تھیں اور معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ کرتی تھیں اوراپنے ہونٹ دباتی تھیں اورسرہلاتی تھیں۔

آئی کُو غالبًا یہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح مسائل کھڑی کرکے اُس بوڑھے وحشی خاندان کو برباد کیا جاسکتا ہے تاکہ اسے اورنوجوان وحشیکو کوئی راستہ نہ ملے۔وہ مسٹروی سے خوفزدہ نہ تھی۔اس نے اسے دوبار دیکھا تھا اور وہ ماسوائے ایک گول چہرہ والے شخص سے زیادہ کچھ نہ تھا..........اور اس طرح کے لوگ تواس کے اپنے گاؤں میں بہت تھے، محض ذرا سے رنگ کے کالے تھے۔

چوآنگ مُوسان کے حقے کا سارا تمبا کوجل چکا تھا مگر وہ ابھی تک کش لگا رہا تھا۔اسے پتہ تھا کہ وانگ کے بعد پانگ نامی گاؤں آتا ہے۔گاؤں کے شروع میں موجودلٹریری سٹار پویلین پہلے ہی نظر آرہا تھا۔وہ اتنی باریہاں آچکا تھا کہ اس کے بارے میں بات کرنا بے کار تھا، اسے یاد تھا کہ کس طرح اس کی بیٹی روتی ہوئی گھرآئی تھی، اس کا خاونداورسسرکس بری طرح سے اس سے پیش آئے تھے اورکس طرح اس نے انہیں نقصان پہنچایا تھا۔ماضی ایک بار پھراس کی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔عموماً جب اسے یادآجاتا کہ اس نے کس طرح شیطانوں کوسزا دی تھی، تو وہ ایک سردمہر مسکان مسکرا دیتا۔۔۔مگراب کی بار ایسا نہ تھا۔ساتویں مالک کی موٹی صورت نے کسی صورت مداخلت کی تھی، اوروہ اپنی سوچوں کودبا رہا تھا۔

کشتی لگاتار خاموش چلتی رہی۔صرف بدھ مت کی مناجات ضخامت میں پھولتی رہیں۔ باقی سب لوگ آئی کُو اوراس کے باپ کی طرح فکروں میں ڈوبے لگ رہے تھے۔

''یہ رہا انکل مُو، پانگ گاؤں''۔

وہ کشتی بان کی آواز سے جاگے تو انہیں اپنے سامنے لٹریری سٹار پویلین نظر آیا۔

چو آنگ نے ساحل پر چھلانگ لگائی اور آئی گُو نے بھی اس کے پیچھے یہی کیا۔ وہ پویلین سے گزرے اور مسٹروی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جنوب کی طرف تیس مکانات کے بعد وہ ایک موڑ مڑ گئے اور اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

گیٹ پر تین کشتیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ وہ بہت بڑے سیاہ گیٹس سے گزرے۔ انہیں گیٹ کے ساتھ والے کمرے لے جایا گیا۔ کمرہ کشتی بانوں اور کسانوں سے بھرا ہوا تھا جو کہ دو میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ آئی گُو نے ان کی طرف نظریں اٹھانے کی جرات نہ کی مگر اس نے ایک تیز نگاہ چاروں طرف ڈال دی اور دیکھا کہ وہاں بوڑھے وحشی اور نوجوان وحشی کے کوئی آثار نہ تھے۔

جب ایک ملازم یخنی اور نئے سال کا کیک لایا، تو وجہ نہ جانتے ہوئے آئی گُو نے مزید بے چینی محسوس کی ''محض مجسٹریٹی کا امتحان پاس کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہماری زبان میں بات نہ کرے''۔ اس نے سوچا ''یہ عالم لوگ جو حقیقت جانتے ہیں ہمیشہ انصاف سے چمٹے رہتے ہیں۔ مجھے ساتویں مالک کو سارا قصہ بتا دینا چاہیے، اُس وقت سے جب میں پندرہ برس کی عمر میں بیاہ دی گئی تھی۔۔۔۔''۔

جب اس نے یخنی ختم کی تو وہ جانتی تھی کہ وقت یہی ہے۔ وہ ایک ملازم کے پیچھے پیچھے اپنے والد کے ساتھ بڑے ہال تک آ گئی اور استقبالیہ کمرے میں داخل ہوئی۔

کمرہ اشیا سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں بہت سارے مہمان بھی تھے جن کے چھوٹے سرخ و نیلے رنگ کے کوٹ اس کے چاروں جانب چمک رہے تھے۔ ان کے درمیان میں ایک بیٹھا شخص تھا۔ اس نے فوراً ہی جان لیا کہ یہی ساتواں مالک ہوگا۔ گو کہ اس کا گول سر اور گول چہرہ تھا، وہ مسٹر وی اور دوسروں سے اچھا خاصا بڑا تھا۔ اس کے بڑے گول چہرے پر تنگ آنکھیں تھیں، کالی مونچھیں تھیں اور وہ گنجا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ سرخ اور چمکدار تھے۔ آئی گُو ایک لمحہ کیلئے تو متذبذب ہوئی، پھر یہ نتیجہ نکالا کہ اس نے ضرور سور کی چربی سے اپنی کھال کی مالش کی ہوگی۔

''یہ ایک قیمتی پتھر ہے جو قدماء تدفین میں استعمال کرتے تھے''۔

ساتواں مالک کچھ تھاما ہوا تھا جو ایک کھوکھلا شدہ پتھر لگتا تھا، اور جب وہ باتیں کر رہا تھا تو اس نے اس چیز سے دو بار اپنی ناک رگڑ لی۔ ''یہ حالیہ کھدائی میں ملی۔ یہ اب بھی قیمتی ہے۔ یہ ہان بادشاہت سے بعد کے زمانے کا نہ ہوگا''۔

گھرانے کے کئی افراد بھی وہاں تھے۔ جنہیں ابھی تک آئی گُو نے محسوس نہیں کیا تھا اس لئے کہ وہ ساتویں مالک سے اس قدر مرعوب تھے کہ وہ معمولی سے کھٹمل لگ رہے تھے۔

وہ سمجھی نہیں کہ وہ اب تک کیا کہہ رہا تھا۔ اسے اُن کے موضوع سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ ہی اس نے تحقیق کی جرات کی۔ اس کے برعکس وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آس پاس دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے دیوار کے پاس بوڑھے وحشی اور نوجوان وحشی کھڑے تھے۔ اس نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ چھ ماہ قبل وہ جب اتفاقاً اُن سے ملی تھی اس کی نسبت اب وہ بوڑھا لگ رہا تھا۔

مسٹروی نے چو آنگ مُوسان سے پوچھا۔

''صرف آپ دونوں آئے ہیں؟''

''ہاں صرف ہم دونوں''۔

''آپ کے بیٹوں میں سے کوئی کیوں نہ آیا؟''

''اُن کے پاس وقت نہیں تھا''۔

''اگر یہ کام نہ ہوتا تو ہم آپ کو نئے سال کے موقع پر آنے کی زحمت دیتے۔۔۔۔ مجھے یقین ہے آپ خوب لطف اندوز ہوتے۔ ہمیں ملے ہوئے دو سال ہو گئے۔ ہیں ناں؟۔ میں کہتا ہوں کہ دشمنی جاری رکھنے سے اس کا ختم کرنا اچھا ہے۔ چونکہ آئی گُو کا خاوند اس کے ساتھ مزید نہیں رہ سکا، اور اُس کے والدین آئی گُو کو پسند نہیں کرتے۔۔۔۔ تو بہتر تھا کہ میں نے جو مشورہ دیا تھا اس پر عمل کر لیتے اور ان کی علیحدگی کروا لیتے۔ میں آپ کو قائل نہیں کر سکا، مگر آپ کو معلوم ہے کہ ساتواں مالک، انصاف کا علمبردار ہے۔ اور ساتویں مالک کی رائے وہی ہے جو کہ میری ہے۔

بہر حال، وہ کہتا ہے کہ دونوں طرفین کچھ رعایتیں دیں، اور اس نے شیھ فیملی کو مصالحت

کے لئے دس مزید ڈالر کا اضافہ کرنے کا کہا۔ اب یہ نوے ڈالر بنتے ہیں''۔

''نوے ڈالرز! اگر آپ یہ مقدمہ بادشاہ تک بھی لے جاتے تو اس قدر مناسب شرائط نہ ملتیں۔ سوائے ساتویں مالک کے کوئی دوسرا شخص اتنی بڑی پیشکش نہیں کر سکتا!''

ساتویں مالک نے چوآنگ مُوسان کی طرف اثبات میں سر ہلایا۔

آئی گُو نے دیکھا کہ صورتحال نازک تھی اور وہ حیران ہوگئی کہ اس کا باپ، جس کے سامنے ساحلی خاندان ادب میں کھڑے ہوتے تھے، یہاں ایک لفظ بھی نہیں کہہ رہا۔ اس نے سوچا کہ یہ بہت عجیب بات تھی۔ گو کہ وہ ساتویں مالک کی ساری باتیں نہ سمجھ سکی مگر اسے وہ ایک مہربان بوڑھی روح لگا اور وہ اس قدر خوفناک نہیں لگ رہا تھا جس طرح کہ اس نے تصور کیا تھا۔

''ساتواں مالک ایک عالم ہے جو سچ جانتا ہے'' اس نے جرات سے کہا'' وہ ہم دیہاتی لوگوں جیسا نہیں ہے۔ میرے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے جو اُن تمام زیادتیوں کی شکایت کرے جو مجھ پر کی گئیں۔ اب میں خود وہ ساتویں مالک کو بتاؤں گی۔ جب سے میری شادی ہوئی میں نے ایک اچھی بیوی ہونے کی کوشش کی۔ میں اندر جاتے اور باہر نکلتے وقت اپنا سر جھکاتی رہی اور میں واحد بیوی والے ایک بھی فریضہ کے ادا کرنے میں ناکام نہ رہی۔ مگر وہ مجھ میں نقص ڈھونڈتے رہے ۔۔۔ ہر شخص ایک دھونس بن چکا تھا۔ اس سال گیدڑ نے بڑا مرغا مارا تو انہوں نے مجھ پر دڑبہ بند نہ کرنے کا الزام کیوں لگایا؟ یہ وہ بدبخت خارشتی آوارہ تھا جس نے دڑبہ کا دروازہ پھوگ ملے چاول چوری کرنے کے لئے کھول دیا تھا۔ مگر وہ جوان وحشی سیاہ اور سفید میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس نے میری گال پر تھپڑ مار دی تھی ۔۔۔''

ساتویں مالک نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے پتہ تھا کہ اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ اور ساتویں مالک کو ضرور اس کا پتہ ہوگا۔ اس لئے کہ عالم لوگ جنہیں سچ کا علم ہوتا ہے سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ اس کتیا پر فریفتہ ہو گیا تھا اور اس لئے وہ مجھے نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مناسب جشن کے ساتھ اس سے شادی کی تھی ۔۔۔ چائے کے تین برتنوں اور چھ تحفوں کے ساتھ ۔۔۔ اور اس کے گھر دلہن کی پالکی میں لے جائی گئی۔ کیا اس

کیلئے مجھے ایک طرف اچھال پھینکنا اس قدر آسان ہوگا؟ ۔۔۔۔۔۔ میں انہیں سبق پڑھاؤں گی۔ میں کورٹ تک جاؤں گی۔ اگر ڈسٹرکٹ کورٹ میں اس کا فیصلہ نہیں ہوتا تو میں بڑی عدالتتک جاؤں گی ۔۔۔''

''ساتواں مالک یہ سب جانتے ہیں'' مسٹروی نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا'' آئی گُو اگر تم یہی رویہ جاری رکھو گی، تو یہ تمہارے فائدے میں نہیں جائے گا۔ تم کچھ بھی نہیں بدلی ہو۔ دیکھو، تمہارا والد کس قدر فہمیدہ ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ تم اور تمہارا بھائی اُس جیسے نہیں ہیں۔ فرض کرو تم یہ بات بڑی عدالت تک لے جاتی ہو، تو کیا وہ ساتویں مالک سے رجوع نہیں کرے گی؟ مگر تب معاملہ پبلک ہو جائے گا اور پھر کسی کے بھی احساسات کا خیال نہیں رکھا جائے گا ۔۔۔ یہ اسی طرح ہو گا ۔۔۔۔''

''ضرورت پڑے تو میں اپنی جان دے سکتی ہوں، خواہ اس سے دونوں خاندان تباہ ہی ہو جائیں!''

''ایسے ہیجانی اقدامات کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ ساتواں مالک آہستگی سے بولا'' تم ابھی تک کم سن ہو۔ ہم سب کو امن رکھنا چاہیے۔'' امن روٹی دیتا ہے'' والی ضرب المثل غلط نہیں ہے۔ میں نے پورے دس ڈالر کا اضافہ کیا ہے جو کہ زیادہ سخاوت ہے۔ اگر تمہارا سسر اور ساس کہتے ہیں کہ'' جاؤ!'' تو تمہیں ہر صورت جانا ہوگا۔ بڑی عدالتکی باتیں نہ کرو، ہر جگہ ایسا ہی ہے خواہ وہ شنگھائی ہو، پیکنگ ہو یا بیرونِ ملک۔ اگر تمہیں مجھ پہ بھروسہ نہیں، تو اِس سے پوچھو۔ یہ ابھی ابھی پیکنگ میں غیر ملکی سکول سے آیا ہے''۔ وہ گھر کے نوکیلی ٹھوڑی والے فرد کی طرف دیکھ کر بولا'' کیا ایسا نہیں ہے ؟''

نوکیلی ٹوڑھی والا آہستہ اور مودب انداز کا جواب دینے کے لئے تیزی سے سیدھا ہو گیا'' ۔۔۔ بل ۔۔۔ گل''

آئی گو نے خود کو مکمل اکیلا محسوس کیا۔ اس کے باپ نے بولنے سے انکار کر دیا، اس کے بھائیوں نے آنے کی جرات نہ کی، مسٹروی ہر وقت دوسری طرف تھا، اور اب ساتواں مالک اس کا

ساتھ چھوڑ گیا، جبکہ حتیٰ کہ یہ کمسن اپنی نرم گفتاری کے ساتھ وہی کچھ کہہ رہا تھا جس کی اس سے توقع تھی۔ مگر کنفیوز ہونے کے باوجود اس نے آخری موقف پر کھڑا ہونے کا فیصلہ کیا۔

''ساتواں مالک بھی کیا کرتا ہے'' اس عورت کی آنکھیں حیرت اور مایوسی دکھا رہی تھیں۔''ہاں۔۔۔۔ میں جانتی ہوں، ہم اکھڑ دیہاتی لوگ جاہل ہیں۔ میرے والد پر تو یہ الزام بھی ہے کہ وہ لوگوں سے برتاؤ کرنا بھی نہیں جانتا۔۔۔ وہ اپنی پرانی حاضر جوابی تک بھی مکمل طور پر کھو چکا ہے۔ وہ بوڑھے وحشی اور نوجوان وحشی کو ہر کام میں آزاد چھوڑ چکا ہے۔ وہ ہر طرح سے اپنی بات منواتے ہیں، خواہ وہ جس قدر ناجائز کیوں نہ ہوں، گری ہوئی باتیں ہوں یا اس سے بھی بڑھ کر ۔۔۔۔۔''

''اس عورت کو دیکھو ساتواں مالک''۔ نوجوان وحشی جو اُس عورت کے پیچھے خاموش کھڑا تھا، اچانک بول پڑا ''وہ حتیٰ کہ ساتویں مالک کے سامنے ایسا کہنے کی جرات کر رہی ہے۔ گھر میں وہ ہمیں بالکل چین سے نہیں رہنے دیتی۔ وہ میرے باپ کو بوڑھا وحشی کہتی ہے اور مجھے نوجوان وحشی یا پھر حرامی''

''کون شیطان تمہیں حرامی کہہ رہا ہے؟'' آئی گُو نے درشت لہجے میں سے اسے دیکھا اور پھر ساتویں مالک کی طرف متوجہ ہوا۔''میں ایک بات برسرِ عام کہنا چاہتی ہوں۔ وہ ہمیشہ میرے لئے حقیر تھی، ہمہ وقت ''فاحشہ'' اور ''کتیا''۔ جب سے اُس نے اس رنڈی کے ساتھ تعلقات شروع کیے تو اس نے حتیٰ کہ میرے آباؤ اجداد کو بھی برا بھلا کہنا شروع کیا۔ ساتواں مالک، ہم دونوں کا فیصلہ کریں۔۔۔''

اس نے کہنا شروع کیا اور الفاظ اس کے ہونٹوں پر مر گئے اس لئے کہ اچانک ساتویں مالک نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور اپنا گول چہرہ اٹھایا۔ اس کے کالی مونچھوں سے فریم کیے ہوئے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی:

''ادھر آؤ!۔۔۔۔''

اُس کا دل جو کہ ایک دھڑکن ضائع کرتا تھا، اچانک زور سے دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا پانسہ

پلٹ گیا اور جنگ ہاری جا چکی تھی۔ اس نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا اور پانی میں گر گئی تھی، اور وہ جانتی تھی کہ سارا قصور اُس کا اپنا ہے۔

نیلے چوغے اور سیاہ جیکٹ میں ایک شخص فوراً ہی اندر آیا اور ساتویں مالک کے سامنے اپنا اسلحہ بازو میں لٹکائے لکڑی کے بت کی طرح کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں اتھاہ خاموشی تھی ساتویں مالک نے اپنے لب ہلائے، مگر کوئی بھی نہ سن سکا کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ صرف اس کے ملازم نے سنا، اور اس کے حکم کی دہشت اس کی ہڈیوں تک میں داخل ہوئی، اس لئے کہ وہ دوبارہ جھٹکا کھا گیا جیسے دبدبے کے قابو میں آیا ہو۔ اس نے جواب دیا
:

''جی اچھا، سر''۔ پھر وہ کئی قدم پیچھے ہٹا، مڑا اور باہر چلا گیا۔

آئی گُو جانتی تھی کہ کوئی غیر متوقع اور مکمل طور پر ناگمان واقعہ ہونے والا ہے.......... ایسی چیز جس کو روکنے کی طاقت اس میں نہ تھی۔ ابھی اس کو ساتویں مالک کی قوت کا پتہ چلا۔ وہ اس سے پہلے غلط تھی، اور گستاخانہ عمل کرتی تھی۔ اس نے تلخی سے افسوس کیا اور خود کو یہ کہتے سنا:

''میں نے ہمیشہ ساتویں مالک کا فیصلہ ماننا چاہا..........''۔

کمرے میں ایک گہری خاموشی تھی گو کہ اس کے الفاظ ریشم کی طرح نرم تھے، وہ مسٹروی پر بادل کی گرج تھے۔

''اچھا؟۔ وہ آگے جھکتے ہوئے رضامندی کے انداز میں بولا''ساتواں مالک واقعی منصف ہے، اور آئی گُو واقعی معقول ہیں۔ اس طرح، مُوسان، تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے، اس لئے کہ تمہاری بیٹی نے خود رضامندی دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے شادی کے سرٹیفکیٹ لانے کو کہے تھے تم لائی ہوگی۔ اس لئے دونوں طرفین کو انہیں ابھی مہیا کرنے دو...........''۔

آئی گُو نے والد کو اپنی کمر پہ بندھی پیٹی کے اندر کسی چیز کو تلاش کرتے ہوئے دیکھا۔ چھڑی جیسا ملازم ساتویں مالک کو ایک کچھوے جیسی شکل کی کالی، چپٹی اور چھوٹی چیز دینے پھر اندر آ گیا۔ آئی گُو ڈر گئی کہ ضرور کوئی خوفناک بات ہونے والی ہے۔ اس نے اپنے والد کی طرف دیکھنے

کی جرات کی، مگر وہ میز پر ایک نیلے کپڑے کا تھیلا کھول رہا تھا اور اس میں سے چاندی کے ڈالر نکال رہا تھا۔

ساتویں مالک نے کچھوے کا منہ کھولا، اس کے اندر سے کوئی چیز نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھی، پھر چپٹی چیز چھڑی جیسے نوکر کو لوٹا دی۔ اس نے ایک انگلی ہتھیلی پر رگڑ لی، پھر اسے ہر نتھنے میں گھسیڑ دیا، جس سے اس کی ناک اور اوپر کا ہونٹ چمکدار پیلے رنگ میں رنگ گئے، پھر اس نے ناک یوں پکڑ لی جیسے چھینکنے والا ہو۔

چوآنگ مُوسان چاندی کے ڈالر گن رہا تھا۔ مسٹر وی نے ایک نہ گنے گئے ڈھیر سے کچھ ڈالر اٹھا لیے اور بوڑھے وحشی کو دیدیے۔ اس نے سرخ اور سبز سرٹیفکیٹوں کی جگہیں بھی بدل لیں اور انہیں انکے اصلی مالکوں کو لوٹا دیا۔

''انہیں چھوڑ دو مُوسان'' اس نے کہا۔ ''تمہیں سمجھنا چاہئیے کہ رقم پوری ہے؟۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے............ یہ ساری چاندی...........''۔

''آچھُو!''

گو کہ آئی گُو جانتی تھی کہ یہ صرف ساتویں مالک کی چھینک ہے، مگر پھر بھی وہ اس کی طرف پلٹ کر دیکھنے سے باز نہ آئی۔ اس کا منہ مکمل طور پر کھلا ہوا تھا اور اس کی ناک پھڑ پھڑا رہی تھی ۔ وہ اب بھی دونوں انگلیوں میں وہ چیز مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا'' جو کہ قدیم لوگ تدفینوں میں استعمال کرتے تھے۔ وہ اس چیز سے اپنی ناک کے پہلو کو رگڑ رہا تھا۔

چوانگ مُوسان نے کسی قدر مشکل کے ساتھ رقم گن لی، اور دونوں اطراف نے سرخ اور سبز سرٹیفیکیٹ دور کر دیے۔ وہ سب اب گھمبیر صورت سے نجات پا کر پرُسکون لگ رہے تھے۔ مکمل ہم آہنگی تھی۔

''خوب۔ یہ معاملہ اطمینان بخش طور پر حل ہوگیا''۔ مسٹر وی بولا۔ اس نے جب دیکھا کہ اب وہ روانہ ہونے کو ہیں تو اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب سارا کام ہوگیا۔ اس مسئلے کے حل ہو جانے پر مبارکباد۔ کیا آپ کا جانا ضروری ہے؟۔ رک جائیں اور سالِ نو کی دعوت

کھا کر جائیں۔ یہ موقع کبھی کبھار آتا ہے''۔

''نہیں ہمیں جانا چاہیئے''۔ آئی گُو بولی۔ ''ہم آپ کے ساتھ پینے کے لئے اگلے سال آجائیں گے''۔

''شکریہ مسٹر وی۔ ابھی پی نہیں سکتے۔ ہمیں اور کام ہے...........''۔ چوانگ مُوسان، بوڑھا وحشی اور نوجوان وحشی بڑے معزز انداز میں روانہ ہوئے۔

''جانے سے قبل ایک قطرہ بھی نہ پیئیں گے؟''۔ مسٹر وی نے آئی گُو سے کہا۔

''جی نہیں، ہم نہیں پیئیں گے۔ بہت شکریہ مسٹر وی''۔

چھ نومبر 1925

کتے کا خواب

’’میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک تنگ گلی سے گزر رہا ہوں۔ میرا لباس بھکاری کے لباس کی طرح پھٹا پرانا ہے۔

ایک کتے نے میرے پیچھے بھونکنا شروع کردیا۔

مجھے غصہ آیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اسے ڈانٹنے لگا۔

’’چخ، چخ، چخ!!

’’اپنا منہ بند رکھو!

’’دولتمند اور مالدار کو دیکھتے ہو تو سر جھکا لیتے ہو اور اس کے سامنے دم ہلاتے ہو مگر کسی غریب اور مفلس کو دیکھتے ہو تو تنگ کرتے ہو!!‘‘۔

’’معاف فرمایئے! ہم ابھی تک انسانوں کی طرح اتنے اچھے نہیں بنے کہ اچھے برے کو جان سکیں اور فرق کرسکیں‘‘۔

’’کیا کہا؟‘‘ میں غصے سے لال پیلا ہوگیا اس لیے کہ میرے خیال میں اس سے زیادہ بڑی بے عزتی نہیں ہوسکتی تھی۔

’’مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ابھی تک کھرے کھوٹے، ریشم وکھدر، حاکم ورعایا اور آقا وغلام کے درمیان فرق نہیں کرسکتا میں............‘‘۔

میں واپس مڑا اور بھاگ نکلا۔

’’رک جایئے، ہم کچھ اور گفتگو کرلیں............‘‘۔

مگر میں پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔ اتنا بھاگا کہ خواب کی حدود سے باہر نکل آیا اور واپس چارپائی پہ تھا۔

تلوارسازی

می چین چیہہ ابھی ماں کے پہلو میں لیٹا ہی تھا کہ چوہے برتن کے لکڑی کے ڈھکنے سے کو کترنے کرنے کیلئے باہر نکلے۔آواز اس کے اعصاب کو لگی۔اس نے جو نرم آوازیں نکالیں انہوں نے پہلے تو کچھ دیر تک تو اثر ہوا مگر اب چوہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔اور جس طرح جی چاہتا کٹر کٹر اور چپ چپ کرنے لگے۔اس نے انہیں بھگانے کے لئے زور سے آواز نکالنے کی جرات نہ کی، اس خوف سے کہ کہیں ماں نہ جاگ جائے۔ وہ سارے دن کی مشقت سے اس قدر چور تھی کہ سرہانے پر سر رکھتے ہی سوگئی تھی۔

بڑے عرصے بعد خاموشی ہوگئی۔اس کی آنکھ لگ ہی گئی تھی کہ ایک ناگمان آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔اس نے زمین کو پنجوں سے کھودنے کی آواز سنی۔

''اچھا، مجھے یقین ہے کہ تم ڈوب چکے ہو''

وہ بستر سے اٹھا، چاندنی کی مدد سے دروازے تک گیا۔اس نے اس کے پیچھے سے جلنے والی لکڑی ٹٹول کر اٹھائی، پائن لکڑی کا ایک چھلکا جلایا اور پانی کے گڑھے پہ روشنی ڈالی۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ایک موٹا چوہا گرا ہوا تھا۔ پانی اتنا کم تھا کہ وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔وہ محض چاروں طرف تیر رہا تھا۔گڑھے کے کناروں کو پنجوں سے کریدتے ہوئے۔۔۔۔۔۔''اچھی مہمان نوازی ہو رہی ہے تمہاری'' لڑکے نے مسرت سے کہا۔ یہ ان مخلوق میں سے ایک تھی جو اسے ہر رات فرنیچر کو کترتی ہوئی جگاتی تھیں۔اس نے منظر کو دلکش بنانے کرنے کے لئے لکڑی کا جلتا چھلکا مٹی کی دیوار

میں ایک چھوٹی سوراخ پہ لگایا اس جانور کی چھوٹی آنکھوں نے اسے نفرت دلا دی۔ایک سوکھے ہوئے سرکنڈے تک پہنچنے کے لئے اس نے اسے پانی کے نیچے دھکیلا۔کچھ وقت بعد اس نے سرکنڈے اور چوہے کو دور کیا۔چوہا سطح پر آ گیا اور ارد گرد تیرتے ہوئے گڑھے کے طرف پنجے چلائے، مگر پہلے سے کم قوت کے ساتھ۔اس کی آنکھیں پانی کے نیچے تھیں۔۔۔صرف تیزی سے ناک سے سانس لیتی ہوئی اس کی نوکدار ناک نظر آتی تھی۔۔۔۔کچھ عرسے تک وہ سرخ ناک والوں سے کراہت کرتا رہا تھا۔مگر اب اسے اس نوکدار سرخ ناک سے ہمدردی ہونے لگی۔اس نے اپنا سرکنڈا چوہے کے پیٹ کے نیچے رکھا۔چوہے نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور اس کے تنے پر چڑھا۔مگر اس کے پورے جسم کا منظر۔۔۔۔فر کو پیچھے بھگوتا ہوا دھبوں بھرا پیٹ، کیڑے جیسی دم ۔۔۔اسے ایک بار پھر اس طرح نفرت دے گئے کہ اس نے تیزی سے سرکنڈے کو جھٹکا دیا۔چوہا دوبارہ گڑھے میں پانی اچھالتا ہوا گر گیا۔اس نے اس کے سر پر کئی بار ضربیں لگائیں تا کہ وہ ڈوب جائے۔۔۔۔۔اب پائن کا چھلکا چھ بار بدل گیا۔تھکا ہوا چوہا گڑھے کے وسط میں آدھا ڈوبا تیر رہا تھا۔کبھی کبھی سطح پر آنے کی بے جان سی کوشش کرتا۔ایک بار پھر بچے کو ترس آ گیا۔اس نے سرکنڈے کو دو حصوں میں توڑ دیا، اور کافی دقت سے جانور کو فرش پر رکھا۔شروع میں اس نے اسے نہیں مارا، پھر چوہے نے ایک ایک سانس اٹکتا ہوا لیا، بہت وقت بعد اس کے پیر ہلے اور وہ الٹا ہو گیا۔اس نے می چین چیہہ کو ایک حرکت پر اکسایا۔اس نے جبلی طور پر اپنا بایاں پاؤں اٹھایا اور زور سے نیچے لایا۔اس نے ایک چھوٹی چیخ سنی۔ جب وہ نیچے جھکا تو دیکھا کہ چوہے کے نتھنوں پہ خون تھا۔۔۔۔وہ شاید مر چکا تھا۔

اسے دوبارہ افسوس ہوا، اس قدر زیادہ جیسے اس نے کوئی جرم کر لیا ہو۔وہ وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، اور اسے گھورتا رہا، کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا۔

اس وقت تک اس کی ماں جاگ چکی تھی۔

''کیا کر رہے ہو بیٹے؟'' اس نے بستر سے پوچھا۔

''چوہا تھا''۔وہ تیزی سے اٹھا اور اسے مختصر سا جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ چوہا تھا۔مگر تم کیا کر رہے ہو؟ اسے مار رہے ہو یا بچا رہے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔لکڑی کا چھلکا جل کر ختم ہو چکا تھا۔وہ وہاں اندھیرے میں کھڑا تھا اور آنکھوں کو چاند کی زرد روشنی کا عادی بنا رہا تھا۔

''آدھی رات کو تم سولہ برس کے ہو جاؤ گے، مگر تم ابھی تک وہی کے وہی ہو۔۔۔۔اسی طرح بے پرواہ۔۔۔۔تم کبھی نہ بدلو گے۔لگتا ہے کہ کسی کو تمہارے باپ کے انتقام کا نشانہ نہ بننا پڑے گا''۔

سلیٹی چاندنی میں بیٹھی اس کی ماں سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔اس کی نچلی آواز میں موجود لامحدود غم نے اس پر بھی کپکپی طاری کر دی۔اگلی صبح البتہ اس کی رگوں میں پھر گرمی دوڑ رہی تھی۔

''میرے باپ کا انتقام؟۔کیا اسے انتقام کی ضرورت ہے؟''۔وہ دلچسپی میں آگے کی طرف بڑھا۔

''ہاں، ہاں ۔۔اور یہ فریضہ تمہارے اوپر پڑا ہے۔میں بہت عرصے سے تمہیں بتانا چاہتی تھی مگر تم چھوٹے تھے اس لئے نہ بتایا۔اب تم بچے نہ رہے حالانکہ حرکتیں بچوں کی سی کرتے ہو۔مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔کیا تم جیسا لڑکا ایک مردوالا کام کر سکتا ہے؟''

''میں کر سکتا ہوں۔ماں بتاؤ مجھے۔میں بدل جاؤں گا''۔

''یقیناً۔تمہیں بدلنا پڑے گا۔۔۔اچھا ادھر آؤ''۔

وہ اس کے پاس چلا گیا۔اس کی ماں بستر پر بیٹھی تھی۔اس کی آنکھیں سائے جیسی سفید چاندنی میں چمک رہی تھیں۔

''سنو!''۔اس نے گھمبیر سنجیدگی سے کہا:''تمہارا باپ تلواریں بنانے میں مشہور تھا۔سب سے بہترین۔فاقوں سے بچنے کی خاطر میں نے اس کے اوزار بیچ دیئے اس لئے کچھ بھی نہ بچا جو تم دیکھ سکو۔مگر وہ دنیا بھر کا بہترین تلوار ساز تھا۔بیس برس قبل بادشاہ کی حاملہ داشتہ نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو جنم دیا جس کا حمل کہتے ہیں اسے اس وقت ٹھہرا تھا جب اس نے آہنی ستون کو گلے لگایا

تھا۔یہ خالص اور شفاف لوہا تھا۔بادشاہ کو احساس ہوا کہ یہ ایک نایاب خزانہ ہے۔اس نے اس سے ایک تلوار بنوانے کا فیصلہ کر لیا۔تاکہ اس سے وہ اپنی سلطنت کی حفاظت کرے، اپنے دشمنوں کو قتل کرے اور خود اپنی حفاظت کو یقینی بنائے۔بدقسمتی سے تمہارے ہی باپ کو اس کام کے لئے چنا گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے وہ لوہا گھر لایا۔پورے تین سال تک رات دن اس نے اسے فولاد بنانے میں لگا دیے اور اس طرح اس نے اس سے دو تلواریں بنائیں۔

''کیا خوفناک منظر تھا جب اس نے بالآخر اپنی بھٹی کھولی! سفید بخارات کا ایک بگولا آسمان میں بلند ہوا تھا، زمین دھک اٹھی تھی۔سفید بخارات اسی جگہ پر سفید بادل بنے۔حرارت سے یہ ایک گہرا قرمزی رنگ کا بنا اور ہر چیز پر ایک آڑو کے پھولوں جیسا رنگ چھا گیا۔ہماری کالی سیاہ بھٹی میں دو سرخ تلواریں رکھی تھیں۔جب تمہارا باپ ان پر کنویں کے شفاف پانی کو قطرہ قطرہ گرا رہا تھا تو تلواروں سے سی سی کی آوازیں بلند ہوئیں اور وہ آہستہ آہستہ نیلی ہوتی گئیں۔اس طرح سات دن سات راتیں گزر گئیں اور تلواریں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔مگر اگر غور سے دیکھتے تو وہ ابھی تک بھٹی میں تھیں، خالص نیلی اور اس طرح شفاف جیسے دو برف کی لمبی قلمیں ہوں۔

''تمہارے باپ کی آنکھوں میں عظیم مسرت چھلکتی تھی۔اس نے تلواریں اٹھائیں، انہیں سہلایا اور پیار سے کھیلا۔پھر اس کی پیشانی پر غم کی شکنیں نمودار ہوئیں۔اس نے تلواروں کو دو منقش صندوقوں میں رکھا۔

''تم آخری دو دن صرف اس عجیب وغریب احساس میں گزارو کہ ہر شخص کو معلوم ہوا ہوگا کہ تلواریں تیار ہو گئیں''۔اس نے مجھے کہا''کل مجھے جا کر ایک بادشاہ کو پیش کرنا ہوگا۔اور وہی میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔مجھے ڈر ہے کہ شاید ہم دوبارہ نہ مل سکیں''۔

''میں دہشت زدگی اور غیر یقینی میں حیران تھی کہ اسے کیا جواب دوں۔میں صرف یہ کہہ سکی۔''مگر تم نے تو اس قدر عمدہ کام کیا''۔

''آہ، تم نہیں سمجھو گی۔بادشاہ شکی مزاج اور ظالم ہے۔اب جبکہ میں نے دو تلواریں بنائی ہیں جس کا اسے پتہ نہیں۔وہ یقیناً مجھے قتل کر دے گا تاکہ میں اس کے مخالفوں کے لئے تلواریں نہ بنا

سکوں‘‘۔

میں نے آنسو بہائے۔

’’غمناک نہ ہو‘اس نے کہا’’کوئی اور راستہ نہیں۔آنسو تقدیر کو دھو نہیں سکتے۔میں کچھ عرصے سے اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں‘‘۔اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔اس نے ایک میان میرے گھٹنوں پہ رکھ دی۔

’’یہ ہے نر تلوار،اس نے مجھے بتایا‘‘اسے رکھو۔کل میں مادہ تلوار بادشاہ کے پاس لے جاؤں گا۔اگر میں واپس نہ آیا تو سمجھ لینا کہ میں مرا ہوا ہوں۔تم تو چار یا پانچ ماہ سے بستر میں میرے ساتھ رہی ہو۔ماتم نہ کرنا بلکہ ہمارا بچہ پیٹ میں پالو اور اس کی اچھی پرورش کرو۔جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اسے یہ تلوار دے دینا اور اسے کہہ دینا کہ اس سے بادشاہ کا سر کاٹ کر میرا انتقام لے لے‘‘۔

’’کیا میرا باپ اس دن واپس آیا تھا؟‘‘لڑکے نے پوچھا۔

’’وہ نہیں آیا‘‘۔ماں نے سکون سے جواب دیا۔’’میں نے ہر جگہ پوچھا مگر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔بعد میں کسی نے مجھے بتایا کہ تمہارے باپ کی بنائی تلوار کو جس پہلے خون سے رنگ دیا گیا تھا وہ تمہارے باپ کا خون تھا۔اس خوف سے کہ کہیں اس کی روح محل کا پیچھا نہ کرے انہوں نے اس کے جسم کو سامنے کے گیٹ پر دفن کر دیا اور سر کو عقبی پارک میں‘‘۔

مئی چین چیہہ نے یوں محسوس کیا جیسے اسے آگ لگ گئی ہو اور اس کے سر کے ایک ایک بال سے شعلے بلند ہو رہے ہوں۔اس نے اندھیرے میں اپنی مٹھی اس زور سے بھینچ دی کہ ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں آئیں۔

اس کی ماں اٹھ کھڑی ہوئی اور بستر کے سرہانے پہ لگا تختہ ہٹا دیا۔پھر اس نے روشنی کی، دروازے کے پیچھے سے ایک بیلچہ اٹھایا اور اس حکم کے ساتھ بیٹے کے حوالے کیا:’’کھودو‘‘۔

گو کہ لڑکے کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا اس نے خاموشی سے کھودنا شروع کر دیا۔اس نے پانچ فٹ تک زرد مٹی کھودی۔تب زمین کا رنگ ایک سڑی ہوئی لکڑی جیسا ہو گیا۔

’’دیکھو،اب احتیاط سے کھودنا‘‘۔ماں چیخی۔

اپنے بنائے ہوئے سوراخ کے ساتھ لیٹے وہ سڑی ہوئی لکڑی تک پہنچا۔اس کی انگلیوں کے سرے برف کی طرح ایک ٹھنڈی چیز سے ٹکرائیں۔یہ خالص شفاف تلوار تھی۔اس نے اس کا دستہ تلاش کیا،اسے گرفت میں لے لیا اور باہر نکال لیا۔کھڑکی سے باہر چاند اور ستاروں نے اور اندر پائن چھلکے کی روشنی نے یکدم اپنی چمک کھو دی۔فضا ایک نیلاہٹ،فولادی روشنی سے بھر گئی۔اور اس فولادی روشنی میں تلوار حل ہوتی نظر آئی اور نظروں سے غائب ہوتی گئی۔مگر جب لڑکے نے غور سے دیکھا تو اسے تین فٹ لمبی چیز دکھائی دی جو کوئی خاص تیز نہ لگی۔۔۔اصل میں اس کی دھار ایک پیاز کے پتے کی طرح گول تھی۔

’’تمہیں اب مزید نازک نہیں ہونا ہے‘‘۔

اس کی ماں نے کہا’’یہ تلوار سنبھالو اور اپنے باپ کا انتقام لو‘‘۔

’’میں نے پہلے ہی نزاکت ترک کر دی ہے۔اس تلوار سے میں اس کا انتقام لوں گا‘‘۔

’’مجھے یہی امید ہے۔ایک نیلا کوٹ پہنو اور تلوار اپنی پشت پہ کس کر باندھ کر لو۔دونوں ایک ہی رنگ کے ہونگے تو کوئی دیکھ نہ سکے گا۔میں نے کوٹ تیار کر رکھا ہے‘‘۔اس کی ماں نے بستر کے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔’’تم کل سے اس کام پہ جاؤ۔میری فکر نہ کرو‘‘۔

مئی چین چیہہ نے نیا کوٹ پہن کر دیکھا تو وہ اس پہ خوب فٹ آتا تھا۔اس نے اسے تلوار کے ساتھ اچھی طرح لپیٹ لیا اور سرہانے کے نیچے رکھا اور دوبارہ سکون سے لیٹ گیا۔اس کو یقین تھا کہ اس نے پہلے ہی نزاکت ترک کر دی تھی۔اس نے اس طرح عمل کرنے کا ارادہ کر لیا جیسے اس کے دماغ میں کچھ نہیں ہے۔اس نے سیدھا نیند میں جانے،اور حسب معمول اگلی صبح اٹھنے اور پھر اپنے فانی دشمن کی تلاش میں نکل پڑنے کا ارادہ کر لیا۔

البتہ،وہ سو نہ سکا۔وہ پہلو بدلتا رہا،ہر وقت اٹھ بیٹھنے کے لئے بے چین۔اس نے اپنی ماں کی لمبی،نرم،نا امید ٹھنڈی آہیں سنیں۔پھر اس نے مرغ کی پہلی بانگ سنی اور جان لیا کہ نیا دن طلوع ہو گیا۔اور اس کی عمر اب سولہ برس ہے۔

2

می چین چیہہ نے سوجھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گھر چھوڑ دیا۔۔۔۔ایک بار بھی مڑ کر پیچھے دیکھے بنا۔ نیلے کوٹ میں، پشت پر تلوار لٹکائے، وہ تیزی سے شہر کی طرف روانہ ہوا۔مشرق میں ابھی تک روشنی نہ تھی۔رات کے بخارات ہر پتے کی چوٹی پر چمٹے ہوئے تھے۔مگر جب تک وہ جنگل کے آخری سرے تک پہنچا،شبنم کے قطرے صبح صادق میں ایک ایک کر کے چمکنے لگے۔دور اسے شہر کی فصیل کے گہرے سیاہی مائل رنگ کی لکیر کی صورت نظر آئی۔

سبزی فروشوں میں گھل مل کر وہ شہر میں داخل ہوا۔گلیاں شور سے بھری ہوئی تھیں۔لوگ گروہوں میں فارغ کھڑے تھے۔عورتیں اپنے دروازوں میں سے سر نکالتی تھیں۔ان میں سے اکثر کی آنکھیں زیادہ سونے کی وجہ سے سوجھی ہوئی تھیں،ان کے بال کنگھی نہ تھے اور ان کے چہرے زرد تھے اس لئے کہ ان کے پاس سرخی پاؤڈر کا وقت نہ تھا۔

می چین چیہہ نے محسوس کیا کہ کوئی بہت بڑا واقعہ ہونے والا ہے،جس کا انتظار یہ لوگ گرمجوشی مگر صبر سے کر رہے تھے۔

بڑھتے ہوئے ایک بچہ اس کی پشت پر موجود تلوار کی نوک سے ٹکرا گیا۔اسے ٹھنڈے پسینے آئے۔وہ اس جگہ سے شمال کی جانب زیادہ دور نہیں گیا جب اس نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک مجمع گردنیں بلند کر کر کے سڑک کی طرف دیکھ رہا ہے۔اس نے مجمع میں عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنیں۔اس خوف سے کہ کہیں اس کی نظر نہ آنے والی تلوار کسی کو زخمی نہ کر دے اس نے مجمعے میں گھسنے کی جرات نہ کی۔مگر لوگ تھے کہ چلے آ رہے تھے اور پیچھے کی جانب سے اسے دھکیلتے جا رہے تھے۔اسے ان کے رستے سے دور جانا پڑا،اتنی دور کہ اسے گردنیں لمبی کرنے والوں لوگوں کی پشت ہی نظر آتی تھی۔

اچانک سامنے کے لوگ ایک ایک کر کے گھٹنوں کے بل گرے۔دور سے دو گھڑ سوار ساتھ ساتھ گھوڑے دوڑاتے نظر آئے۔ان کے پیچھے جنگجو تھے جنہوں نے لاٹھیاں، تیر،تلواریں،

نیزے اور جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ان کی گرد سے فضا پیلی ہو چکی تھی۔ان کے پیچھے ایک بڑی بگھی نظر آئی جسے چار گھوڑے کھینچ رہے تھے۔اس میں سازندے گھنٹے،ڈھول اور پھونک والے اوزاروں سے عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ان کے پیچھے چمکدار ملبوسات میں درباریوں کی بگھیاں تھیں، بوڑھے یا کوتاہ قد لوگ،ان کے چہرے پسینے میں چمک رہے تھے۔ان کے پیچھے تلواروں، نیزوں اور اور بھالوں سے مسلح گھڑ سوار تھے۔پھر سجدے میں گرے لوگوں نے سر اٹھائے اور می چین چیہہ نے ایک عظیم بگھی دیکھی جس پہ ایک پیلا شامیانہ تھا اس کے وسط میں بھڑکیلے رنگدار لباس میں ملبوس ایک موٹا آدمی بیٹھا تھا۔اس کی بھوری مونچھیں تھیں اور چھوٹا سر تھا۔اس نے اسی طرح کی تلوار پہن رکھی تھی جس طرح کی کہ لڑکے کی پشت پر تھی۔

می چین چیہہ پر ایک جبلی لرزہ طاری ہوا،مگر فوراً ہی خود کو جلتا ہوا گرم محسوس کیا۔اپنی پشت پہ موجود تلوار کے دستے کو پکڑ کر اس نے سجدہ ریز مجمعے میں سے اپنا راستہ بنایا۔مگر وہ پانچ چھ قدم تک نہ گیا ہو گا کہ کسی نے اسے ٹھوکر ماردی اور وہ ایک پُرشکن چہرے والے ایک نوجوان کے اوپر سر کے بل گر گیا۔وہ سراسیمگی میں یہ دیکھنے اٹھا کہ کہیں اس کی تلوار کی نوک نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا مگر اسی وقت اسے اپنی پسلی پر دو مکے وصول ہوئے۔احتجاج کے لئے رکے بغیر وہ سڑک کی طرف دیکھنے لگا مگر پیلے شامیانہ والی بگھی گزر چکی تھی۔حتیٰ کہ اس کے پیچھے والے داروغے بھی غائب ہو چکے تھے

۔

سڑک کے دونوں اطراف سجدہ ریز لوگ دوبارہ کھڑے ہو گئے۔پُرشکن چہرے والے نوجوان نے می چین چیہہ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا اور اسے جانے نہیں دے رہا تھا۔اس نے اس پر ایک شمسی اوزار کے کچلنے کا الزام لگایا اور لڑکے کو اپنی زندگی سے جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا اگر وہ 80 سال سے کم عمر میں مرا۔فارغ تماشائی اردگرد جمع ہو گئے مگر بولے کچھ نہیں۔پھر کچھ نے پُرشکن نوجوان کی طرفداری کی۔مجمع اس پر فقرے کس رہا تھا۔می چین چیہہ اس طرح کے دشمنوں پر نہ تو ہنس سکتا تھا اور نہ طیش میں آ سکتا تھا۔وہ ان سے جان بھی نہیں چھڑا پا رہا تھا۔یہ سلسلہ چلتا رہا اور ادھر وہ بے صبرا ہوتا جا رہا تھا۔

تب لوہے کے ڈنڈے کی مانند ایک کالا لاغر شخص مجمعے کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی داڑھی اور آنکھیں کالی تھیں۔ ایک لفظ کہے بغیر وہ می چین چیہہ پہ سرد مہری سے مسکرا دیا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھایا اور پُرشکن چہرے والے نوجوان کے جبڑے پر مکا رسید کیا اور اس کی آنکھوں میں گھورنے لگا۔ نوجوان نے لڑکے کی گردن چھوڑ دی اور چلا گیا۔ کالا شخص بھی چلا گیا۔ ناراض مجمع بھی چھٹ گیا۔ ان میں سے کچھ می چین چیہہ کے پاس آئے اس سے اس کی عمر اور پتہ پوچھا اور یہ بھی کہ اس کی کوئی بہن گھر میں ہے۔ مگر اس نے انہیں نظرانداز کیا۔

وہ جنوب کی طرف چل دیا۔ یہ سوچ کر کہ جمگھٹے والے شہر میں وہ کسی کو حادثاتی طور پر زخمی نہ کر دے۔ بہتر ہے کہ وہ جنوبی گیٹ پر بادشاہ کی واپسی کا انتظار کرے تاکہ اپنے باپ کا انتقام لے سکے۔ وہ کھلی اور ویران جگہ اس مقصد کے لئے بہترین جگہ تھی۔ اب تک سارا شہر پہاڑ پر بادشاہ کی سیر کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ کیا سواری ہے! کیا شان ہے! بادشاہ کا دیدار کرنے میں کتنا اعزاز ہے!۔ انہوں نے خود کو اس قدر چھوٹا کر دیا تھا کہ انہیں ساری قوموں کے لئے مثال کے بطور پیش کرنا چاہیے تھا۔ وہ شہد کی مکھی کی طرح بھنبھناتے تھے۔ البتہ جنوبی گیٹ کے قریب نسبتاً خاموشی تھی۔ شہر چھوڑنے کے بعد وہ ایک بڑے توت کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ساتھ لائی ہوئی روٹی کھانے لگا۔ کھاتے ہوئے ماں کے تصور نے اس کے گلے میں ایک گرہ سی پیدا کی مگر آئی اور گزر گئی۔ چاروں طرف خاموشی چھانے لگی۔ جب تک کہ اسے صرف اپنی سانس کی آواز ہی سنائی دینے لگی۔ جونہی شام ہوگئی تو اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر زور دیا مگر بادشاہ کے آنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ دیہاتی جو سبزی بیچنے شہر آئے تھے ایک ایک کر کے خالی ٹوکریوں کے ساتھ گھروں کو واپس ہو رہے تھے۔ بہت دیر بعد کالا شخص شہر سے باہر نکل رہا تھا۔

’’بھاگو، می چین چیہہ! بادشاہ تمہارا پیچھا کر رہا ہے!‘‘ اس کی آواز جیسے الّو بول رہا ہو۔

می چین چیہہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ وہ مبہوت ہو کر کالے آدمی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ اتنی تیز بھاگ رہا تھا جیسے اس کے پر لگ گئے ہوں۔ آخر کار اکھڑتی سانس سنبھالنے جب ذرا رکے تو اسے معلوم ہوا کہ وہ جنگل کے کنارے تک پہنچ گئے ہیں۔ بہت دور پیچھے ابھرتے چاند کی

چاندی کی لکیر نظر آ رہی تھی مگر سامنے صرف کالے شخص کی آنکھیں تھیں جو چھلاوے کی طرح چمک رہی تھیں۔

’’تم نے مجھے کیسے پہچانا؟۔۔۔‘‘ لڑکے نے خوفناک تعجب میں پوچھا۔

’’میں ہمیشہ سے تمہیں جانتا ہوں‘‘ وہ شخص ہنسا۔ ’’میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے اپنے باپ کا انتقام لینے کے لئے پشت پر نر تلوار اٹھا رکھی ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم ناکام ہو جاؤ گے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ آج کسی نے تمہارے خلاف اطلاع کر دی ہے۔ تمہارا دشمن مشرقی گیٹ سے واپس محل چلا گیا اور تمہاری گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے‘‘۔

می چین چیہہ دہشت زدہ ہونے لگا۔

’’اچھا، اسی لئے ماں نے گہری سانس لی تھی‘‘۔ وہ بڑبڑایا۔

’’مگر وہ صرف آدھی بات جانتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ تمہارے باپ کا انتقام میں لوں گا‘‘۔

’’تم؟ کیا تم میری خاطر انتقام لینے پر تیار ہو، انصاف کے چیمپین؟‘‘

’’ارے یہ لقب دے کر میری توہین نہ کرو‘‘۔

’’اچھا تو پھر تو یہ بیواؤں اور یتیموں سے ہمدردی کی وجہ ہوگی‘‘۔

’’بچے، ایسے الفاظ مت استعمال کرو جو آلودہ ہو چکے ہیں‘‘ اس نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ’’انصاف، ہمدردی اور اس طرح کے الفاظ، جو ایک زمانے میں صاف ہوتے تھے مگر اب ابلیسی استعمال کنندوں کے لئے سرمایہ بن چکے ہیں۔ ان الفاظ کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ میں صرف تمہارا انتقام لینا چاہتا ہوں‘‘۔

’’خوب، تو تم یہ کرو گے کیسے؟‘‘

’’میں تم سے صرف دو چیزیں چاہتا ہوں‘‘ اس کی آواز دونوں جلتی آنکھوں سے آتی محسوس ہوئی۔

’’کون سی دو چیزیں؟‘‘

''پہلی تمہاری تلوار اور پھر تمہارا سر''۔

می چین چیہہ کو یہ خواہش عجیب لگی۔ مگر گو کہ وہ جھجک رہا تھا، وہ خوفزدہ نہ تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ گنگ سا ہو گیا۔ سنگدل آواز نے بات جاری رکھی ''یہ اب تم پر منحصر ہے۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتبار آئے تو میں جاؤں گا، وگرنہ نہیں''۔

''مگر تم میرا انتقام کیوں لو گے؟ کیا تم میرے والد کو جانتے تھے؟''

''میں اسے شروع سے جانتا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح میں تمہیں جانتا ہوں۔ مگر وہ وجہ نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے میرے عقلمند بچے کہ میں انتقام لینے میں کس قدر ماہر ہوں۔ جو تمہارا ہے وہ میرا ہے۔ جس بات کی تمہیں تشویش ہے اس کی مجھے تشویش ہے۔ میں اپنے روح پر دوسروں کے ہاتھوں اور خود اپنے ہاتھوں اس قدر زخم اٹھائے پھر رہا ہوں کہ اب مجھے خود سے نفرت ہو گئی ہے''۔

اندھیرے میں خاموشی چھا گئی۔ می چین چیہہ نے پشت سے نیلی تلوار نکالنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور اسی جھٹکے سے اپنی گردن اڑا دی۔ جونہی اس کا سر اس کے پیروں پہ سبز کائی پر گرا، اس نے تلوار کالے آدمی کو پکڑا دی۔

''آہا!'' آدمی نے ایک ہاتھ سے تلوار اٹھائی اور دوسرے ہاتھ سے می چین چیہہ کا سر بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اس نے دو مرتبہ مردہ گرم لبوں کو چوما اور ٹھنڈے یخ قہقہے لگانے لگا۔

اس کے قہقہے جنگل میں پھیل گئے۔ یک دم جنگل کی گہرائی میں چمکتی آنکھیں چھلاوے کی روشنی کی طرح شعلہ فگار ہوئیں اور اگلے لمحے اتنی نزدیک آئیں کہ ان بھوکے بھیڑیوں کی پھنکار سنائی دینے لگی۔ ایک ہی ہلّے میں می چین چیہہ کا کوٹ تار تار ہو چکا تھا، دوسرے ہلّے نے اس کا پورا بدن ٹھکانے لگا دیا، جبکہ فوراً ہی خون چاٹ کا صاف کر دیا گیا تھا۔ صرف ایک آواز آ رہی تھی ور وہ ہڈی چبانے کی تھی۔

بھیڑیوں کے غول کے سربراہ نے کالے آدمی پر چھلانگ لگا دی۔ مگر نیلی تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا سر اس کی قدموں میں سبز کائی پہ پڑا تھا۔ ایک ہی ہلّے میں بھیڑیوں نے اس کی کھال تار تار کر دی، دوسرے سے اس کا پورا جسم ٹھکانے لگ گیا، اور خون فوراً ہی چاٹ کر صاف کر

دیا گیا۔ صرف ایک آواز آ رہی تھی اور وہ ہڈی چبانے کی تھی۔

کالے شخص نے می چین چیہہ کا سر لپیٹنے کے لئے زمین سے نیلا کوٹ اٹھا لیا۔ اسے باندھ کر اور تلوار اپنی پشت پر لگا کر وہ مڑا' اور اندھیرے میں دارالحکومت کی طرف پھلانگتا ہوا روانہ ہوا۔

بھیڑیے کوہان نکالے، زبانیں نکالے، ہانپتے منجمد و ساکت کھڑے تھے۔

وہ اندھیرے میں دارالحکومت جاتے ہوئے ایک باریک آواز میں گاتا جا رہا تھا:

گاؤ ''ہے'' گاؤ ''ہو''
وہ تنہا شخص جو تلوار سے محبت کرتا تھا
موت کو اپنا انعام سمجھتا تھا
وہ جو تنہا جاتے ہیں افراط میں ہیں
جو تلوار سے محبت کرتے ہیں کبھی تنہا نہیں ہوتے
دشمن کے لئے دشمن، ہاں ہاں، سر کے بدلے سر!!
دو آدمی خود اپنے ہاتھوں مر گئے

3

بادشاہ کو پہاڑ کی سیر میں مزہ نہیں آیا، اور پھر سڑک پر منتظر ایک قاتل کی موجودگی کی خفیہ رپورٹ نے اسے مزید مغموم کر دیا۔ وہ اس رات سخت غصے میں تھا۔ اس نے شکایت کی کہ آج نویں داشتہ کے بال بھی اتنے سیاہ نہ تھے جتنے کہ ایک روز پہلے تھے۔ خوش قسمتی سے شاہی گھٹنوں پر بیٹھ کر داشتہ نے بے شمار ناز نخرے دکھائے تب جا کر آخر کار بادشاہ کی شکنیں نرم پڑ گئیں۔

مگر اگلے دن دو پہر کو جاگنے پر بادشاہ کا موڈ پھر خراب تھا۔ جب تک دو پہر کا کھانا ختم ہوا تو وہ غضبناک ہو گیا تھا۔

''میں بور ہوں'' وہ منہ کھول کر چیخا۔

ملکہ سے لے کر نیچے درباری مسخرے تک سب پر بدحواسی چھا گئی۔ بادشاہ عرصہ سے اپنے بوڑھے وزیروں کے وعظوں اور اپنے قلابازی کھانے والوں، بے شمار ٹھنگنوں کے مسخروں سے تھک چکا تھا۔ حال ہی میں وہ رسی پہ چلنے والوں، کھمبوں پر چڑھنے والوں، جادوگروں، تلوار نگلنے والوں اور آگ تھوکنے والوں کے شاندار کرتبوں سے بھی بے زار لگ رہا تھا۔ اس پہ غصے کے دورے پڑتے تھے جس کے دوران وہ تلوار نکال لیتا اور معمولی بات پر لوگوں کو قتل کر دیتا۔

دو ہیجڑے کھیلنے کے بعد محل واپس آئے تھے، دربار پہ حکمرانی کرنے والی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے یہ جانتے تھے کہ سخت مشکل دوبارہ منڈلا رہی تھی۔ ان میں سے ایک خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ دوسرا، البتہ، بہت اعتماد سے، بغیر تیزی کیے بادشاہ کے پاس چلا گیا:

''آپ کا غلام آپ کو مطلع کرنے کی التجا کرتا ہے کہ آپ کا یہ غلام ایک ایسے زبردست آدمی سے ملا ہے جس کے پاس نادر قسم کی مہارتیں ہیں جو شہنشاہ معظم کو محظوظ کر سکتا ہے''۔

''کیا؟''۔ بادشاہ الفاظ کا اصراف نہیں کرتا۔

''وہ لاغر، کالا آدمی ہے جو ایک بھکاری لگتا ہے۔ اس نے نیلا لباس پہن رکھا ہے، ایک نیلا بنڈل پشت پر ہے اور عجیب تُک بندی والے گیت گاتا ہے۔ جب پوچھا تو کہتا ہے کہ وہ اس قدر حیران کن تماشے کر سکتا ہے کہ جنہیں ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔۔۔ وہ دنیا میں انوکھے تماشے ہیں اور بالکل نئے ہیں۔ انکا نظارہ ساری پریشانی ختم کر دے گا اور دنیا میں امن لائے گا۔ مگر جب ہم نے دکھانے کو کہا تو اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اسے ایک سونے کا اژدھا (1) چاہیے اور ایک سنہری دیگ۔۔۔۔''

''ایک سنہرا اژدھا؟ ۔ وہ تو میں ہوں۔ اور سنہری دیگ؟ تو میرے پاس ہے''۔

''یہی کچھ آپ کے اس غلام نے سوچا۔۔۔''

''اسے اندر لاؤ''

بادشاہ کی آواز ختم ہونے سے پہلے چار گارڈ ہیجڑے کے ساتھ نکلے۔ ملکہ سے لے کر نیچے دربار کے مسخرے تک، سب مسرت سے دمکنے لگے، اس امید میں کہ یہ شعبدہ باز ساری پریشانی کو ختم

کر دے گا اور دنیا میں امن لائے گا۔

اور اگر یہ شو ناکام بھی ہو جائے تو لاغر کالے اور بھکاری نظر آنے والے آدمی ہی کو شاہی غضب کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ بس اسے پہنچنے دو سب ٹھیک ہو گا۔

انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چھ آدمی سنہرے تخت کی طرف تیز تیز آئے۔ ہیجڑہ آگے آگے تھا۔ راستہ دکھاتا ہوا۔ چار گارڈوں کے بیچ کالا آدمی آ رہا تھا۔ نزدیک تر معائنہ میں وہ اسکا نیلا کوٹ، کالی داڑھی، کالے ابرو اور کالے بادل دیکھ سکتے تھے۔ وہ اس قدر لاغر تھا کہ اس کے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں اور آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ جونہی وہ ادب سے جھکا تو انہوں نے اس کی پشت پر گہرے سرخ رنگ سے نقش و نگار کیے نیلے کپڑے میں لپٹا ایک چھوٹا گول بنڈل دیکھا۔

''اچھا''۔ بادشاہ بے صبری میں چیخا۔ اس شخص کے اسباب و ڈھنگ کی سادگی اس کے کرتبوں کی خصوصیت کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔

''آپ کے اس غلام کا نام ین چیہہ آ ژچی ہے، میں ون وین گاؤں میں پیدا ہوا۔ کسی خاص پیشے کیلئے تربیت نہیں کی گئی مگر جب میں بڑا ہوا تو ایک دانا سے ملا جس نے مجھے ایک لڑکے کے سر کے ساتھ شعبدہ بازی کرنا سکھا دیا۔ گو کہ میں اکیلا ایسا نہیں کر سکتا۔ ایک سنہرے اژدھا کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ اور میرے پاس پانی سے بھرا ایک سنہری دیگ کا ہونا ضروری ہے۔ پھر جب لڑکے کا سر اندر ڈالا جائے اور پانی کھولنے لگے تو سر ابھرے گا اور گرے گا اور ہر طرح کی شکلیں بنا بنا کر رقص کرے گا۔ یہ ایک شاندار طریقے سے ہنسے گا بھی اور گائے گا بھی۔ جو کوئی بھی اس کا گانا سنے گا اور اس کا رقص دیکھے گا وہ بے غمی کا کوئی اختتام نہ جانے گا۔ جب سارے لوگ اسے دیکھیں گے تو ساری دنیا میں امن ہو جائے گا۔

''چلو شروع کرو''۔ باشاہ نے اونچی آواز میں حکم دیا۔

انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک بہت بڑا سنہری دیگ جو ایک بیل پکانے کے لئے کافی تھا، باہر رکھا گیا۔ اسے صاف پانی سے بھر لیا گیا۔ اس کے نیچے کوئلے جلائے گئے۔ کالا شخص ایک طرف کھڑا تھا۔ جب کوئلے سرخ ہوئے تو اس نے اپنا بنڈل نیچے رکھا اور اسے کھولا۔ پھر

اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک لڑکے کا سر اٹھا لیا جس کے عمدہ ابرو تھے، بڑی آنکھیں تھیں، سفید دانت تھے اور سرخ ہونٹ تھے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے الجھے بال ہلکے نیلے دھویں جیسے تھے۔ کالے شخص نے اسے اوپر اٹھایا، ایک چکر لگایا تاکہ سارا مجمع اسے دیکھ سکے۔ اس نے اسے دیگ کے اوپر اٹھایا اور کچھ نہ سمجھنے والے الفاظ میں بڑبڑاتا رہا اور آخر میں اسے اس کے اندر پھینک۔ پانی میں اس کی آواز آئی۔ بھاپ تقریباً پانچ فٹ اونچا اٹھا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

کافی وقت تک کچھ نہ ہوا۔ بادشاہ بے صبرا ہو گیا، ملکہ، داشتائیں، وزراء اور ہیجڑے خطرہ محسوس کرنے لگے جبکہ مزاحیہ بونے تمسخر سے مسکرانے لگے۔ ان مزاحیہ مسکراہٹوں نے بادشاہ کو شک میں مبتلا کر دیا کہ اسے بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ وہ گارڈ کی جانب یہ حکم دینے مڑا کہ اس شخص کا سر قلم کر دیں جس نے اپنے بادشاہ کو دھوکہ دینے کی جرات کی۔ اسے دیگ میں پھینک دیں اور ابال ابال کر مار دیں۔

مگر اسی وقت اس نے پانی کو ابلتے سنا۔ پوری شدت سے جلتی آگ نے کالے آدمی پر ایک سرخی مائل چمک ڈال رکھی تھی۔ بادشاہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ کالے شخص نے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب پھیلائے، خلا کی طرف گھورا اور ایک باریک آواز میں گاتے ہوئے رقص کرنے لگا:

محبت کے لئے گاؤ، محبت کی عظمت کے لئے گاؤ
آہ محبت! آہ خون! کون ایسا نہیں ہے؟
انسان تاریکی میں ٹٹولتے ہوئے، بادشاہ زور سے ہنستا ہے
دس ہزار سر موت میں جھک گئے
میں صرف ایک سر استعمال کرتا ہوں
ایک شخص کے سر کے لئے خون بہانے دو
خون بہنے دو
گاؤ، گاؤ!

جب وہ گا رہا تھا، دیگ میں کھولتا پانی ایک گول پہاڑ کی طرح بلند ہوا بھنور کی مانند

چکر کھاتا ہوا۔ سر پانی کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے اچھلتا رہا، گول سے گول تر گھومتا رہا، پھرتی سے قلابازیاں کھاتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر صرف مسرت کی مسکان دیکھ سکتے تھے۔ پھر اچانک اس نے ایسا کرنا ختم کر دیا اور بہاؤ کے خلاف تیرنا شروع کر دیا، چکر لگاتے ہوئے، آگے پیچھے لپکتے ہوئے، سارے اطراف پانی اچھالتے ہوئے۔ سارے دربار میں گرم قطروں کی بارش سی ہونے لگی۔ ایک بونے پہ کھولتا قطرہ گرا وہ کتے کی طرح بھونکا اور اپنی ناک کھجائی۔ وہ درد کی چیخ کو دبا نہ سکا تھا۔

کالے شخص نے گانا بند کر دیا۔ سر پانی کے درمیان میں بے حرکت رہا، اس کے چہرے پر ایک درشت تاثر تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ آہستہ سے اوپر نیچے اچھلنا شروع کیا۔ اچھل کود میں اس نے اوپر نیچے تیزی سے تیرنا شروع کیا۔ لامتناہی وقار کے ساتھ، تین بار اس نے بطخ کی طرح اوپر نیچے ہوتے ہوئے دیگ کا چکر لگایا۔ پھر، اس کی آنکھیں پھیل گئیں، گہری کالی پتلیاں حیرت انگیز طور پر چمکیں۔ اس نے گانا شروع کر دیا:

بادشاہ کی بادشاہی دور دراز تک پھیلے گی
وہ ہر طرف سے دشمنوں کو فتح کرے گا
دنیا ختم ہو سکے گی مگر اس کی طاقت نہیں
سو یہ ہوں میں مکمل چمکدار
چمک تلوار کو چمکاتی ہے۔۔۔ مجھے نہ بھولنا
ایک شاہی نظر، مگر میرے جیسے عوام غمگین
گاؤ گاؤ ایک شاہی نگاہ
واپس آؤ جہاں چمکدار نیلی روشنی چمکتی ہے

سر اچانک پانی کی چوٹی پر رک گیا۔ کئی قلابازیوں کے بعد یہ پھر اوپر نیچے کھیلنے لگا اور ایک بار پھر گاتے ہوئے دائیں بائیں دلفریب نظریں ڈالتا رہا۔

اس محبت کے لئے جو ہم جانتے ہیں

میں ایک سر کاٹتا ہوں، ایک سر
میں صرف ایک سر استعمال کرتا ہوں، زیادہ نہیں
وہ کئی سر جو وہ استعمال کرتا ہے افراط میں ہیں

گانے کے آخری بول پر سر پانی میں ڈوب گیا تھا اور چونکہ یہ دوبارہ نہیں ابھرا، اس لئے گانا مدھم ہوتا گیا، کھولتا پانی آہستہ آہستہ ایک اترتی موج کی طرح نیچے ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ دیگ کے دھانے سے نیچے گیا۔ فاصلے سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

''اب، آگے؟'' بادشاہ نے انتظار میں تھکتے ہوئے پوچھا۔

''شہنشاہِ معظم''۔ کالا شخص گھٹنوں کے بل جھک کر بولا: ''یہ دیگ کے پیندے میں سب سے معجزانہ رقص کر رہا ہے۔ آپ یہ اس وقت تک نہ دیکھ سکیں گے جب تک کہ قریب نہ آئیں۔ میں اسے اوپر نہیں لا سکتا اس لئے کہ ''اتحاد کا رقص'' دیگ کے پیندے میں کیا جاتا ہے''

بادشاہ اٹھ کھڑا ہوا اور سیڑھیاں اتر کر دیگ کے پاس گیا۔ تپش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ نظارہ کرنے کو آگے جھکا۔ پانی ایک آئینے کی طرح ہموار تھا۔ وہاں بے حرکت پڑے سر نے اوپر دیکھا اور بادشاہ پر نظریں مرکوز کر دیں۔ جب بادشاہ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو اس نے ایک دلکش مسکراہٹ دی۔ اس مسکان نے بادشاہ کو یہ محسوس کرایا جیسے وہ پہلے مل چکے ہوں۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ ابھی وہ اس بات پر حیران تھا کالے آدمی نے اپنی پشت سے نیلی تلوار نکالی اور بجلی کی طرح بادشاہ کی گردن کے منکے کو اڑا دیا۔ بادشاہ کا سر پانی اچھالتے ہوئے دیگ میں گر گیا۔

جب دشمن ملتے ہیں تو وہ ایک ہی نگاہ میں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں، بالخصوص قریبی حلقوں میں موجود دشمن۔ جس لمحے بادشاہ کے سر نے پانی کو چھولیا می چین چیہہ کا سر اس سے ملنے چلا آیا اور وحشت سے اس کا کان کاٹ لیا۔ دونوں سر موت کی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ دیگ کا پانی کھولا اور بلبلے ہوتا رہا۔ تقریباً بیس مدبھیڑوں کے بعد بادشاہ پانچ جگہوں سے زخمی تھا اور می چین چیہہ سات جگہوں سے۔ مشاق بادشاہ اپنے دشمن کے پیچھے سے پھسلنے کی تدبیر کرتا تھا اور ایک بے خبری کے موقع پر می چین چیہہ نے بادشاہ کو اپنی گردن کے پیچھے سے پکڑنے کو موقع دیا، اس طرح

کہ اب وہ مڑ نہیں سکتا تھا۔ بادشاہ نے اپنے دانت اس میں گاڑ لئے، جس طرح کہ توت کے پتے میں ریشم کا کیڑا سرنگ بنا لے۔ درد کے مارے لڑکے کی چیخیں دیگ کے باہر تک سنائی دیتی تھیں۔

ملکہ سے لے کر نیچے دربار کے مسخرے تک جو کہ ابھی تک خوف سے ساکت ہو گئے تھے، ان آوازوں سے دوبارہ جان میں جان آ گئی۔ انہیں لگا جیسے سورج کو تاریکی نے نگل لیا ہو۔ گو کہ وہ کانپ رہے تھے مگر کھلی آنکھوں سے نظارہ کر رہے تھے۔

کالے شخص کا رنگ نہ بدلا۔ بغیر کوشش کیے اس نے اپنا بازو ایک سوکھی شاخ کی طرح بلند کیا اور نظر نہ آنے والی تلوار پکڑ لی۔ وہ آگے کی طرف جھکا جیسے کہ دیگ میں جھانکنا چاہتا ہو۔ اچانک اس کا بازو مڑا اور نیلی تلوار نیچے آئی اور اس کا سر ایک غڑپ کی آواز کے ساتھ دیگ میں گر گیا۔ اور برف کی طرح سفید جھاگ ہر سمت اڑا۔

جونہی اس کا سر پانی میں لگا وہ بادشاہ کے سر پر حملہ آور ہوا۔ اس نے شاہی ناک اپنے دانتوں میں لی اور تقریباً کاٹ ہی ڈالی۔ بادشاہ نے درد سے چیخ ماری اور می چین چیہہ کو خود کو چھڑانے کا موقع ملا۔ وہ جھپٹا مار کر گھوما اور ایک شکنجے جیسی پکڑ کے ساتھ اس کا جبڑا پکڑ لیا۔ انہوں نے اپنی پوری قوت سے مخالف سمتوں میں کھینچا تا کہ بادشاہ اپنا منہ بند نہ کر سکے۔

پھر وہ اس پر وحشیانہ انداز میں حملہ آور ہوئے، جیسے قحط زدہ مرغیاں چاول چگنے لگتی ہوں۔ حتیٰ کہ بادشاہ کا سر بری طرح زخمی ہوا اور وہ پہچاننے کے قابل نہ رہا۔ شروع میں اس نے دیگ میں پاگلوں کی طرح جھپٹے مارے، پھر کراہتا ہوا گر پڑا اور آخر میں خاموش ہو گیا اور مر گیا۔

کالا آدمی اور می چین چیہہ نے کاٹنا بند کر دیا۔ انہوں نے بادشاہ کا سر چھوڑ دیا اور ایک بار پھر دیگ کے کنارے تک گول چکر میں تیرنے لگے تا کہ دیکھ لیں کہ دشمن مکر تو نہیں کر رہا۔ یہ یقین کر کے کہ بادشاہ واقعی مر گیا انہوں نے آپس میں نظریں ملائیں اور مسکرا دیئے۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر دیں۔ ان کے چہرے آسمان کی جانب تھے اور وہ پانی کی تہہ میں ڈوب گئے۔

4

دھواں ختم ہوا، آگ بجھ گئی۔ اب پانی پہ ایک بھی لہر نہ تھی۔ غیر معمولی خاموشی نے ان کے اوسان بحال کر دیئے۔ کوئی ایک چیخا اور بہ یک وقت سب کے سب وحشت سے چیخنے۔ ان میں سے ایک سنہری دیگ تک چل کر گیا اور باقی اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ پیچھے والے اگلوں کی گردنوں کے درمیان سے محض جھانک سکتے تھے۔

گرمی ابھی تک ان کے گالوں کو جھلسا رہی تھی۔ پانی پہ جو کہ اب شیشے کی طرح ہموار تھا، چربی کی تہہ موجود تھی جس سے بے شمار چہرے منعکس ہو رہے تھے: ملکہ، داشتائیں، گارڈ والے، بوڑھے وزراء، بونے، ہیجڑے۔۔۔۔۔

''اوہ خدایا! ہمارے بادشاہ کا سر ابھی تک وہیں ہے!'' چھٹی داشتہ اچانک وحشیانہ طور پر ہچکیاں لینے لگی۔

ملکہ سے لے کر نیچے دربار کے مسخرہ تک سب سراسیمگی میں آ گئے۔ وہ خوفزدگی میں گھر گئے، اور دائرے میں دوڑ رہے تھے۔ عقلمند ترین بوڑھا کونسلر اکیلا آگے گیا اور دیگ کا پہلو چھونے کو ہاتھ بڑھایا۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ فوراً کھینچ لیا اور دو انگلیاں پھونکنے کے لئے منہ کی طرف لے گیا۔

آخر کار دوبارہ سنبھلتے ہوئے وہ محل کے باہر یہ مشورہ کرنے جمع ہوئے کہ بادشاہ کا سر کس طرح نکالا جائے۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ اتنا وقت لے گا جتنا کہ جوار کے تین بڑی کڑھائیوں کے پکانے میں لگتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے: بڑے باورچی خانے سے تار کے بڑے کفگیر جمع کئے جائیں، اور گارڈز کو حکم دیا جائے کہ وہ بادشاہ کا سر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔۔۔۔ جلد ہی ہر کام تیار ہو گیا۔۔۔ تاروں کے بڑے چمچ، سنہری پلیٹیں اور جھاڑنیں دیگ کے قریب رکھ دی گئیں۔ گارڈوں نے آستینیں چڑھا دیں۔ کچھ تاروں کے بڑے بڑے چمچوں کے ساتھ، کچھ چھلنی کے ساتھ، باقیات لانے تیار تھے۔ بڑے چمچ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے، اور دیگ کے کناروں کو چھو رہے تھے۔ کچھ وقت بعد ایک گارڈ نے سخت چہرے کے ساتھ اپنا بڑا چمچ دونوں ہاتھوں سے احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ اٹھانا شروع کیا۔ پانی کے قطرے موتیوں کی طرح برتن

سے قطرہ قطرہ گر رہے تھے جس کے اندر ایک برف جیسی سفید کھوپڑی پڑی تھی۔ جب دوسرے حیرت سے چیخ رہے تھے اس نے کھوپڑی سنہری پلیٹ میں ڈال دی۔۔۔۔''

''اوہ ہمارے بادشاہ، ہمارے پیارے!'' ملکہ داشتائیں، وزراء اور حتیٰ کہ ہیجڑے بھی سسکیاں لے کر رو رہے تھے۔ البتہ وہ جلد ہی اس وقت رک گئے جب ایک اور گارڈ پہلی کھوپڑی سے ملتی جلتی ایک کھوپڑی باہر نکال لایا۔۔۔۔ جب پسینہ بہاتے گارڈ پانی سے سامان نکالتے جا رہے تھے تو وہ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سفید بالوں اور کالے بالوں کا ایک الجھا ہوا گچھا نکال لائے اور کئی چمچ چھوٹے سفید اور کالے بال نکال لائے جو یقیناً مونچھوں کے تھے۔ ایک اور کھوپڑی۔ اور پھر بالوں کے تین پن۔۔۔ وہ اسی وقت رک گئے جب پانی میں سے سوائے شوربے کے کچھ اور نہیں نکل رہا تھا۔ انہوں نے جو کچھ نکالا انہیں تین سنہری پلیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک پر کھوپڑیاں، ایک پہ بال اور ایک پہ بالوں کے پن رکھے۔۔۔۔

''شہنشاہ عالی کی تو صرف ایک کھوپڑی تھی، تو پھر ان کا سر کونسا ہے؟'' نویں داشتہ نے بد حواسی میں پوچھا۔۔۔ ''بالکل۔۔۔۔'' وزیروں نے ایک دوسرے کی طرف خوف و ہراس میں دیکھا۔۔۔۔۔ ''اگر کھال اور بال ابال میں جھڑ نہ چکے ہوتے تو بتانا آسان ہوتا''۔ جھکا ہوا بونا بولا......... انہوں نے احتیاط سے کھوپڑیوں کا معائنہ کیا مگر سائز اور رنگ تقریباً ایک جیسے تھے۔ وہ تو یہ بھی فرق نہ کر سکے کہ لڑکے کا کونسا والا ہے۔ ملکہ نے کہا کہ بادشاہ کی دائیں کنپٹی پر زخم کا نشان تھا جو انہیں اس وقت لگا تھا جب کہ وہ ابھی تک شہزادہ تھا، ممکن ہے اس نے کھوپڑی پر کوئی نشان چھوڑ دیا ہو۔ ایک بونے نے ایک کھوپڑی پر اسی طرح کا نشان دیکھا اور ایک عمومی خوشی پیدا ہوئی۔ مگر پھر ایک اور بونے نے اسی طرح کا نشان نسبتاً زرد تر کھوپڑی کی دائیں کنپٹی پر دیکھا.......... ''میں جانتی ہوں!'' تیسری داشتہ مسرت سے بولی ''ہمارے بادشاہ کی ناک اونچی تھی''...... ہیجڑوں نے تیزی سے ناکوں کا معائنہ کرنا شروع کیا۔ بلاشبہ ان میں سے ایک نسبتاً اونچی تھی گو کہ ان میں فرق کرنا کوئی زیادہ آسان نہ تھا، مگر بدقسمتی سے اُس کھوپڑی کی دائیں کنپٹی پر کوئی نشان نہ تھا..... ''مزید برآں'' وزیروں نے ہیجڑوں سے کہا ''کیا شہنشاہِ معظم کی کھوپڑی کی پشت اتنی ابھری ہوئی

تھی؟'' ....'' ہم نے شہنشاہِ معظم کی کھوپڑی کی پشت پر کبھی اتنی توجہ نہ دی تھی......'' ملکہ اور داشتاؤں نے اپنی یاداشتوں پر زور دینا شروع کیا۔ کچھ نے کہا وہ ابھار موجود تھا۔ دوسروں نے کہا کھوپڑی ہموار تھی۔ جب انہوں نے اس ہیجڑے سے پوچھا جو بادشاہ کے بالوں کو کنگھی کرتا تھا تو وہ بھی کوئی جواب نہ دے سکا............

اس شام شہزادوں اور وزراء کی کونسل بیٹھی کہ بادشاہ کی کھوپڑی کا تعین کریں مگر دن بھر والے نتیجے سے کوئی بہتر نتیجہ سامنے نہ آیا۔ آدھی رات تک کا مباحثہ بھی معاملے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ انہوں نے جمائیاں لیتے صبح تک مباحثے کو طوالت دی۔ جب مرغ نے دوسری بار اذان دی تو ایک محفوظ اور اطمینان بخش حل یہ نکلا کہ بادشاہ کے جسم کے ساتھ سنہرے تابوت میں تینوں سر تدفین کے لئے رکھے جائیں............

تجہیز و تکفین ایک ہفتہ بعد ہوا۔ سارا شہر اشتیاق سے منتظر تھا۔ دارالحکومت کے شہری اور دور دراز کے تماشائی جوق در جوق شاہی تکفین کو آئے ہوئے تھے۔ صبح سویرے سڑکیں مردوں عورتوں سے بھر گئیں۔ درمیان کی میزیں دھنس کر رہ گئیں جن پر قربانی کے چڑھاوے رکھے تھے۔ دوپہر کے قریب گھڑ سوار سڑکوں کو کھلا رکھنے نکلے۔ کچھ دیر بعد جھنڈوں، ڈنڈوں، نیزوں، تیر کمانوں سے لیس ایک جلوس آیا جس کے پیچھے موسیقاروں سے بھری چار بگھیاں تھیں۔ پھر ناہموار میدان میں ابھرتے گم ہوتے ایک پیلا شامیانہ قریب آتا گیا۔ سنہری تابوت میں ایک جسم اور تین سر رکھے ہوئے تھے............لوگ سجدہ ریز ہو گئے، جس سے قربانی والی میزوں کی قطاریں نظر آنے لگیں۔
کچھ وفادار رعیتی یہ سوچ کر غصے کے آنسو پی رہے تھے کہ بادشاہ کے ساتھ دو شاہ کُشوں کی روحیں بھی قربانی کے مزے لے رہے ہونگے۔ مگر وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے............
پھر ملکہ اور داشتاؤں کی سواری گزری۔ مجمع نے انہیں دیکھا............اور انہوں نے مجمع کو دیکھا اپنی بَین کو نہ روکتے ہوئے۔ ان کے بعد وزیر آئے، ہیجڑے گزرے اور بونے آئے۔ اُن سب نے ماتمی انداز اپنا رکھا تھا۔ مگر کسی نے ان پہ ذرا سی بھی توجہ نہ دی۔

حاشیہ

1- قدیم چینی بادشاہ اپنا وقار بلند کرنے اکثر خود کو اژدھا کہتے تھے۔ چینی روایت میں اژدھا آسمانی اور آفاقی تھا۔

آہ کیو کی سچی کہانی

لوہسون کا یہ شاہکار افسانہ چینی ادب میں عظیم ترین تحریروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ افسانہ چین میں بد ترین جاگیرداری نظام کے پس منظر میں برپا شدہ 1911 کے بورژوا انقلاب کی زبردست تصویر کشی کرتا ہے۔

(مترجم)

باب اول

تعارف

کئی برس سے میرا ارادہ تھا کہ آہ کیو کی سچی کہانی لکھوں۔ لیکن اس خواہش کے ساتھ ساتھ ایک گھبراہٹ سی بھی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہیں لکھنے سے شہرت نصیب ہوسکتی ہو۔ اس لیے کہ کسی لافانی انسان کے کارنامے ریکارڈ کرنے کیلئے ایک لافانی قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ تحریر کے ذریعے اگلی نسلوں تک جانا جائے۔ ایک ایسی تحریر جو اس شخص کے ذریعے اگلی نسلوں تک جانی جائے۔۔۔۔ جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ کون کس کی شناخت کروا رہا ہے۔ لیکن ہر بار جیسے کسی بھوت پریت نے مجھے قابو کر لیا ہو، اور میں آہ کیو کی کہانی لکھنے کے ارادے سے باز آتا گیا۔

اور جونہی میں نے قلم اٹھایا مجھے اندازہ ہوا کہ ایک بے مثال تصنیف میں تو انتہائی مشکلات

حائل ہوتی ہیں۔ پہلی مشکل یہ تھی کہ اسے کیا نام دیا جائے۔ ''اگر نام درست نہ ہو تو الفاظ سے سچ کی گونج نہ آئے گی'' ۔۔۔۔ اس ضرب المثل کا حد سے زیادہ خیال رکھنا پڑے گا۔ سوانح عمریوں کی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں: آفیشل سوانح عمری، خودنوشت سوانح عمری، بلا اجازت سوانح عمری، آباواجداد کی سنائی ہوئی کہانی، اضافہ کی گئی سوانح عمری، خاندانی تواریخ، خاکے........ مگر بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی میرے مقصد کیلئے موزوں نہ تھی۔ ''آفیشل سوانح عمری؟''، لیکن اس صنف کو بہت ہی ممتاز شخصیات کی سوانح عمریوں کی کسی باوثوق تاریخ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ ''خودنوشت سوانح عمری؟'' لیکن ظاہر ہے کہ میں آہ کیو نہیں ہوں۔ اگر میں اِسے ''بلا اجازت سوانح عمری'' کہوں تو پھر اس کی ''اجازت والی سوانح عمری'' کہاں ہے؟۔ ''لیجنڈ والی کہانی'' کا استعمال ناممکن ہے اس لیے کہ آہ کیو کوئی لیجنڈری شخصیت ہے نہیں۔ ''اضافہ کی گئی سوانح عمری؟'' لیکن کسی صدر نے قومی تاریخ کے انسٹی ٹیوٹ کو آہ کیو کی ایک ''معیاری سوانح عمری'' لکھنے کا حکم کبھی دیا ہی نہیں۔ گو کہ مستند انگریز تاریخ میں ''جواریوں کی زندگیاں'' نہیں ہیں لیکن مشہور مصنف کینن ڈوئل نے روڈنی سٹون لکھا۔ لیکن ایسا تو کوئی بہت ہی مشہور مصنف کر سکتا ہے، میرا جیسا نہیں۔ اب رہ جاتی ہے ''خاندانی تاریخ ''۔ لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ آیا میں اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جس سے آہ کیو کا تعلق تھا۔ اور نہ ہی مجھے اس کے بچوں پوتوں نے ایسا کوئی فریضہ سونپا ہے۔ اگر مجھے ''خاکہ'' لکھنا ہوتا تو یہ اعتراض کیا جاسکتا تھا کہ آہ کیو کی کوئی ''مکمل سرگزشت'' ہے ہی نہیں۔ المختصر، یہ واقعی ایک ''سوانح عمری'' ہے۔ میں یہ آخری دو الفاظ اپنے عنوان کے طور پر اٹھا لیتا ہوں۔ اور اگر یہ قدماء کی ''خطاطی کی سچی کہانی'' سے ملتا جلتا عنوان لگے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ اس طرح کی ایک سوانح عمری ایسے الفاظ سے شروع ہونی چاہیے: ''فلاں جس کا اصل نام فلاں تھا، فلاں جگہ کا رہنے والا تھا''۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ آہ کیو کا خاندانی نام کیا تھا۔ لگتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ ''چاؤ'' تھا مگر پچھلے دنوں اس معاملے پر پھر ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ یہ جھگڑا اُس وقت ہوا جب مسٹر چاؤ کے بیٹے نے کاؤنٹی کا امتحان پاس کیا اور گاؤں میں اس کامیابی کی منادی کرائی گئی۔ آہ کیو، جس نے ابھی ابھی زرد شراب کے دو کٹورے

چڑھائے تھے، اس اعلان کے متعلق شوخی مارنی شروع کردی کہ یہ اعزاز اُس کا بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی اسی قبیلے سے تھا جس سے کہ مسٹر چاؤ تھا۔ اور ایک لحاظ سے تو وہ کامیاب امیدوار سے تین پشت سینئر تھا۔ اُس وقت کئی تماشائی آہ کیو کے احترام میں ذرا سے کھڑے بھی ہوگئے مگر اگلے دن ملازم نے اسے مسٹر چاؤ کے گھر بلالیا۔ جب بوڑھے جنٹلمین کی نظر اُس پہ پڑی تو اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا:

''تم آہ کیو، ذلیل حقیر کیڑے! کیا تم نے ایسا کہا تھا کہ تم اسی قبیلے میں سے ہو جس سے میرا تعلق ہے؟''۔

آہ کیو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسٹر چاؤ جتنا زیادہ اس کی طرف دیکھتا اتنا زیادہ اس کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور کچھ قدم بڑھتے ہوئے اس نے کہا: ''تمھیں ایسی خرافات بکنے کی جرات کیسے ہوئی؟۔ میرا تم جیسا رشتے دار ہو کیسے سکتا ہے؟۔ کیا تمھارا خاندانی نام چاؤ ہے؟''۔

آہ کیو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھسکنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ مسٹر چاؤ آگے بڑھا اور اس کے منہ پہ ایک چانٹا رسید کردیا۔

''تمھیں چاؤ کیسے کہا جائے گا؟۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم چاؤ نام کے قابل ہو؟''۔ آہ کیو نے چاؤ نام کے حق کے دفاع کی کوئی کوشش نہ کی اور اپنا بایاں گال سہلاتے ہوئے سرکاری اہلکار کے ساتھ باہر نکل گیا۔ باہر اسے سرکاری اہلکار سے گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ سننا پڑی۔ جس کسی نے بھی یہ کہانی سنی اُس نے یہی کہا کہ آہ کیو احمق تھا کہ اس نے چاؤ کو اتنی مار کی دعوت دی۔ حالانکہ لگتا نہ تھا مگر پھر بھی خواہ اس کا نام چاؤ تھا بھی تو اسے اس طرح کی ڈینگیں مارنے کے بجائے جاننا چاہیے تھا کہ گاؤں میں ایک ہی مسٹر چاؤ رہتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد آہ کیو کے آباواجداد کا مزید کوئی تذکرہ نہ ہوا۔ لہٰذا مجھے اب تک معلوم نہیں ہے کہ اس کا خاندانی نام اصل میں تھا کیا۔

یہ مضمون لکھتے ہوئے مجھے تیسری مشکل یہ پیش آئی کہ آہ کیو کا شخصی نام کس طرح لکھا جائے۔ اس کی زندگی میں ہر شخص اُسے آہ کیو ہی کہتا رہا، مگر اس کی موت کے بعد کسی نے بھی دوبارہ آہ کیو کا

ذکر نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کا نام ''ریشم اور بانس کے تختے پر محفوظ'' رکھا جائے۔ اگر اس کے نام کو محفوظ رکھنے کا کوئی سوال ہے بھی تو یہ مضمون اس سلسلے کی اولین کوشش ہے۔ چنانچہ مجھے شروع ہی سے اس دشواری کا سامنا ہے۔ میں نے اس معاملے پر بہت غور کیا: آہ کیوئی۔۔ کیا یہ وہی ''کیوئی'' ہے جس کا مطلب دارچینی ہے؟، یا پھر وہ ''کیوئی'' ہے جس کا مطلب اشرافیہ ہے؟۔ اگر اس کا دوسرا نام چاند محل ہوتا، یا اگر اس نے اپنی سالگرہ چاند میلہ کے مہینے میں منائی ہوتی، پھر تو یقیناً یہ دارچینی والا ''کیوئی'' تھا لیکن چونکہ اس کا دوسرا کوئی نام نہ تھا۔ اور اگر تھا تو کسی کو معلوم نہ تھا۔ چونکہ اس نے تعریفی اشعار حاصل کرنے کے لیے سالگرہ پر دعوت نامے بھی کبھی نہ بھیجے، اس لیے آہ کیوئی (دارچینی) لکھنا غلط ہوگا۔ پھر اگر اس کا آہ فیو (دولتمند) کے نام سے کوئی بڑا یا چھوٹا بھائی ہوتا تو یقیناً وہ آہ کیوئی (اشرافیہ) کہلاتا مگر وہ بالکل اکیلا تھا اس لیے اسے آہ کیوئی (اشرافیہ) لکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کیوئی والے بقیہ سارے غیر معمولی الفاظ تو مزید غیر مناسب ہیں۔ میں نے ایک بار یہ سوال مسٹر چاؤ کے بیٹے سے کیا جو ایک کامیاب کاؤنٹی امیدوار تھا۔ مگر اُس جیسا تعلیم یافتہ شخص بھی اس سوال سے چکرا گیا۔ اس کے بقول یہ نام تلاش نہیں ہوسکتا۔ آخری کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنے علاقے کے ایک شخص کو آہ کیو کے معاملے کے قانونی مسودات کا ریکارڈ دیکھنے کو کہا۔ مگر آٹھ ماہ کے بعد اس نے مجھے خط لکھا کہ ریکارڈ میں آہ کیوئی نام کے کسی آدمی کا ذکر موجود نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ یہ سچ تھا، یا پھر میرے دوست نے کچھ کیا ہی نہ تھا۔ چنانچہ نام کا نشان ڈھونڈنے میں ناکامی کے بعد میں اُسے تلاش کرنے کے کسی اور ذریعے کا سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ چونکہ میں جانتا ہوں کہ صوتیات کا نیا نظام ابھی تک عام استعمال میں نہیں آیا اس لیے مغربی حروف تہجی استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ یعنی نام کو انگریزی سپلنگ کے مطابق آہ کیوئی لکھا جائے اور اسے مختصراً آہ کیو لکھا جائے۔ یہ تو ''نیو یوتھ'' نامی رسالے کے موقف کو اندھا دھند تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور میں ایسا کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ مگر چونکہ مسٹر چاؤ کے بیٹے جیسا تعلیم یافتہ شخص بھی میرا مسئلہ حل نہیں کرسکا تو میں اور کیا کرتا؟۔

میرا چوتھا مسئلہ آہ کیو کے آبائی وطن کے بارے میں تھا۔ اگر اس کا خاندانی نام چاؤ تھا

تو ''لوگوں کی علاقائی درجہ بندی'' کے قدیم رواج کے مطابق جو کہ ابھی تک قائم ہے۔ ''سو خاندانی نام'' کے اندر دیکھنا چاہیے اور'' کانسوصوبہ میں تائن شوئی کا رہائشی'' ملے گا۔ مگر بدقسمتی سے یہ خاندانی نام متنازعہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آہ کیو کی اصل جگہ بھی غیر واضح ہے۔ گو کہ وہ زیادہ تر وی چوآنگ میں رہا تھا، مگر وہ دوسری جگہوں میں بھی رہا تھا۔ لہٰذا اسے وی چوآنگ کا مقامی کہنا غلط ہوگا۔ یہ دراصل تاریخ کو بگاڑنے کی بات ہوگی۔

مجھے اطمینان دلانے کی واحد چیز یہ حقیقت ہے کہ لفظ'' آہ'' بالکل صحیح ہے۔ بلاشبہ یہ غلط عالمانہ تنقید کا سامنا اچھی طرح کر سکتا ہے۔ جہاں تک دوسرے مسائل کا تعلق ہے انھیں حل کرنا مجھ جیسے ان پڑھ لوگوں کا کام نہیں ہے۔ جبکہ میں صرف یہ توقع کر سکتا ہوں کہ ڈاکٹر ہوشیہہ کے شاگرد، جنہیں ''تاریخ اور قدیم اشیا سے لگاؤ'' ہے، مستقبل میں ان پہ نئی روشنی ڈال سکیں گے۔ البتہ مجھے خوف ہے کہ اس وقت تک میری'' آہ کیو کی سچی کہانی'' کب کا قصہ پارینہ بن چکی ہوگی۔

باب دو

آہ کیو کی فتوحات کا ایک مختصر جائزہ

آہ کیو کے خاندانی نام، شخصی نام، اور آبائی وطن کے غیر یقینی ہونے کے علاوہ اُس کے'' پس منظر'' سے متعلق بھی اچھی خاصی غیر یقینیت موجود ہے۔ وہ اس لیے کہ وی چوآنگ کے لوگوں نے اُس کے'' پس منظر'' پر ذرا بھی توجہ دیے بغیر محض اس کی خدمات لیں یا محض اُس کا مذاق اڑاتے رہے۔ خود آہ کیو اس موضوع پر خاموش ہی رہا، سوائے اس کے کہ جب وہ کسی سے لڑائی کرتا تو اُس پر نظریں جماتا اور کہتا: ''ہم تم سے بہت زیادہ خوشحال ہوا کرتے تھے! تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟''۔

آہ کیو کا کوئی خاندان نہ تھا مگر وہ وی چوآنگ میں سرپرست دیوتا کے مندر میں رہتا تھا۔ اس کے پاس کوئی باقاعدہ روزگار بھی نہ تھا۔ وہ بس دوسروں کے لیے کام کرتا: اگر گندم کی کٹائی کرنی ہوتی تو وہ کر لینا، اگر چاول پیسنے ہوتے تو وہ پیس لیتا، اگر ایک کشتی کو دھکا لگانا ہوتا تو وہ اسے

دھکیلے لگاتا۔ اگر کام میں کافی وقت لگنا ہوتا تو وہ رات وہیں اپنے عارضی آجر کے گھر بسر کر لیتا۔ مگر جونہی کام ختم ہو جاتا وہ وہاں سے چلا جاتا۔ چنانچہ جب بھی لوگوں کو کام کروانا ہوتا وہ آہ کیو کو یاد کر لیتے، اس کا کام یاد کر لیتے، نہ کہ اس کا'' پس منظر''۔ اور جس وقت کام ختم ہو جاتا تو خود آہ کیو کو بھی بھلا دیا جاتا، اس کے'' پس منظر'' کو تو چھوڑیے۔ ہاں، ایک بار ایک بوڑھے نے تبصرہ کیا تھا'' آہ کیو کتنا اچھا مزدور ہے''۔ اُس وقت آہ کیو کمر تک ننگا، بے پرواہ اور لاغر، اُس کے سامنے کھڑا تھا، اور دوسرے لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ آیا وہ تبصرہ سنجیدہ تھا یا حقارت آمیز تھا، مگر آہ کیو تو خوشی سے نہال ہو گیا۔

آہ کیو خود کو بہت اعلیٰ سمجھتا تھا۔ وہ وی چوآنگ کے سارے باشندوں کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ حتیٰ کہ دونوں جوان'' سکالرز'' کو بھی ایک مسکراہٹ دینے کے قابل بھی نہ سمجھتا تھا، حالانکہ نوجوان سکالر تو سرکاری امتحانات پاس کر کے آتے تھے۔ مسٹر چاؤ اور مسٹر چائن کو پورا گاؤں عزت دیتا تھا، اس لیے کہ امیر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں نوجوان سکالرز کے باپ تھے۔ واحد آہ کیو تھا جو انہیں کوئی خاص عزت نہیں دیتا تھا۔ وہ خود سے یہ کہتا: ''میرے بیٹے اِن سے زیادہ عظیم ہو سکتے ہیں''۔

مزید برآں، چونکہ آہ کیو کئی بار شہر آیا گیا تھا، اس لیے قدرتی طور پر وہ مزید خود پرست ہو گیا حالانکہ بہ یک وقت وہ شہر کے لوگوں کو حقیر سمجھتا تھا۔ مثال کے طور پر، لکڑی کے 3 فٹ 3 انچ سے بنے تختے سے بنے بنچ کو وی چوآنگ گاؤں کے لوگ ''لمبا بنچ'' کہتے تھے۔ آہ کیو بھی اسے ''لمبا بنچ'' کہتا تھا مگر شہر کے لوگ اسے'' سیدھا بنچ'' کہتے تھے اور وہ سوچتا تھا: ''یہ غلط ہے۔ مضحکہ خیز بات!''۔ اسی طرح جب وہ بڑے سر والی مچھلی کو تیل میں فرائی کرتے تھے تو وی چوآنگ گاؤں کے لوگ اس میں نیم انچ طویل ٹکڑے بنائے پیاز کے پتے ملاتے تھے جبکہ شہر کے لوگ اس میں باریک سے ٹکڑے کیے ہوئے پیاز کے پتے ملاتے تھے، اور وہ سوچتا تھا'' یہ بھی غلط ہے۔ کتنا مضحکہ خیز''۔ مگر وی چوآنگ گاؤں والے جاہل زنگ زدہ تھے جنہوں نے شہر کی فرائی مچھلی دیکھی تک نہ تھی۔

آہ کیو جو کہ بہت خوشحال شخص ہوا کرتا تھا، جو دنیاداری کا آدمی تھا اور'' ایک اچھا مزدور

تھا'' وہ ایک جامع شخص ہوسکتا تھا اگر اُس پر چند بدقسمت جسمانی دھبے نہ ہوتے۔ سب سے برے تو اس کی کھوپڑی پہ تھے جہاں ماضی میں، کسی نامعلوم زمانے میں، چمکدار رِنگ ورم کے نشان نمودار ہوئے تھے۔ گو کہ وہ اس کے اپنے سر پر تھے، بظاہر آہ کیو انہیں عزت دار بالکل نہیں سمجھتا تھا، اس لیے وہ لفظ ''رنگ ورم'' استعمال کرنے سے کترانے لگا، یا کوئی ایسا لفظ جو اِس طرح کی آواز دیتا ہو۔ بعد میں وہ اس میں بہتری لایا، ''چمکدار'' اور ''روشن'' کے الفاظ بھی ممنوعہ لفظ بنا ڈالے، جبکہ مزید بعد اس نے ''لیمپ'' اور ''موم بتی'' کے الفاظ کو بھی معیوب بنا ڈالا۔ جب بھی اس معیوبیت کا خیال نہ رکھا جاتا، خواہ ارادتاً ایسا ہوتا یا غیر ارادی طور پر، آہ کیو طیش میں آجاتا۔ اس کے ''رنگ ورم'' والے نشان سرخ ہوجاتے۔ وہ مذاق اڑانے والے کی طرف دیکھتا، اور اگر وہ ترکی بہ ترکی جواب دینے میں کمزور ہوتا تو وہ اُسے بددعا دیتا، اور اگر وہ شخص لڑنے میں کمزور ہوتا تو وہ اُسے پیٹتا۔ اور پھر بھی، حیرت انگیز بات ہے کہ ایسے مدبھیڑوں میں آہ کیو ہی مار کھاتا۔ پھر بالآخر وہ نئی حکمت عملی استعمال کرتا، ایک غضبناک تیوری چڑھا کر خود کو مطمئن کرتا۔

بہرحال ہوا یوں کہ جب آہ کیو نے اس غضبناک نگاہ کا استعمال کرنا شروع کیا تو وی چوآنگ کے فارغ لوگ اس کا مزید مذاق اڑانے لگے۔ جونہی وہ اسے دیکھتے تو وہ اس کی طرف مذاقاً کہتے:

''دیکھو۔ روشنی ہورہی ہے''۔

آہ کیو حسبِ معمول کھڑا ہوتا، اور غصہ سے دیکھتے ہوئے کہتا:

''تو یہاں گاسلیٹ کا لالٹین ہے''۔ وہ کچھ بھی متاثر ہوئے بغیر اپنی بات جاری رکھتے۔

آہ کیو کچھ نہ کرسکتا تھا، بلکہ اپنا دماغ کچھ دیر کے لیے خرچ کرتا: ''تم تو اِس قابل بھی نہیں کہ..........''۔ اس موقع پر لگتا تھا جیسے اس کی کھوپڑی کے نشان معزز اور معتبر ہوں، نہ کہ رِنگ ورم کے عام نشان۔ بہرحال جیسے کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، آہ کیو دنیاوی آدمی تھا: وہ یک دم جان جاتا کہ وہ ''بکواس رواج'' تقریباً توڑ چکا تھا، لہٰذا مزید کچھ کہنے سے پرہیز کرتا۔

اگر وہ لفنگے پھر بھی مطمئن نہ ہوتے اور اس کا مذاق اڑانا جاری رکھتے تو وہ لوگ آخر میں

مکوں پر آجاتے تھے۔ اور جب آہ کیو ہر طرح سے شکست کھا چکتا، اپنی بھوری چوٹی کھچوا چکا ہوتا اور سر تین چار بار دیوار سے لگوا چکا ہوتا، تب ہی وہ فارغ لوگ فتح کے احساس کے ساتھ چلے جاتے۔ آہ کیو ایک لمحے کو وہاں رکتا، خود سے سوچتا ''یہ تو ایسا ہے جیسے مجھے اپنے بیٹے نے پیٹا ہو۔ دنیا کو کیا ہوتا جارہا ہے..........''۔ تب وہ بھی چلا جاتا، مطمئن ہوکر کہ وہ فتح مند ہوچکا۔

جب بھی آہ کیو سوچتا کہ اسے بعد میں لوگوں کو بتانے پہ یقین تھا، لہٰذا وہ سب جو آہ کیو کا مذاق اڑا چکے ہوتے تھے جانتے تھے کہ اُسے یہ سب کچھ نفسیاتی فتح حاصل کرنے کے لیے سہنا پڑا۔ اس لیے جو کوئی اس کی بھوری چوٹی کھینچنے یا مروڑنے کا ارادہ کرتا، اسے آہ کیو کے جواب کا یقین ہوتا۔ اس لیے وہ اسے کہتا:

''آہ کیو یہ ایک بیٹے کے باپ کو پیٹنا نہیں ہے، یہ ایک انسان کا ایک درندے کو پیٹنا ہے ۔ چلو بولو ہم سنیں گے کہ: ایک انسان کا ایک درندے کو پیٹنا!''۔

پھر آہ کیو اپنی چوٹی کی جڑوں کو پکڑے، سر ایک طرف کو لڑھکائے کہتا: ''ایک کیڑے کو پیٹنا..........اب ٹھیک ہے؟۔ میں ایک کیڑا ہوں۔ اب تو مجھے چھوڑ دو!''۔

لیکن گو کہ وہ ایک کیڑا تھا، بے کار لوگ پھر بھی اُسے جانے نہ دیتے جب تک کہ وہ اس کا سر کسی قریبی چیز سے پانچ چھ بار نہ دے مارتے۔ اس کے بعد وہ اپنی روایت کے مطابق، مطمئن ہوکر روانہ ہوجاتے کہ وہ جیت گئے، اس بات پہ مطمئن کہ اس بار آہ کیو کا کام ہوچکا۔ البتہ دس سیکنڈ کے اندر اندر آہ کیو بھی مطمئن روانہ ہوجاتا کہ وہ جیت چکا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ''اپنی بے قدری کرنے والا'' ہے۔ اور یہ کہ اگر ''سب سے بڑی خود تو ہین'' میں سے ''خود تو ہین'' کے لفظ کو نکالا جائے تو بعد میں ''سب سے بڑی'' رہ جاتی ہے۔ کیا سرکاری امتحانات میں بلند ترین کامیاب امیدوار بھی ''سب سے بڑا'' نہ تھا؟''۔ ''اور تمہارا کیا خیال ہے کہ بہرحال تم کیا ہو''۔

اپنے دشمنوں سے برابری حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے چالاک طریقے استعمال کرنے کے بعد آہ کیو مسرت سے شراب کی دکان پر شراب کے چند پیالے پینے چلا جاتا، دوسروں سے پھر اپنا مذاق اڑوانے، پھر اُن سے جھگڑا کرنے، دوبارہ فتح یاب ہوکر نکلنے، اور خوشی خوشی

سرپرست دیوتا کے مندر واپس آنے، اور وہاں بالشت کو چھوتے ہی گہری نیند سو جاتا۔ اگر اس کے پاس پیسہ ہوتا تو وہ جوا کھیلنے چلا جاتا۔ وہاں لوگوں کا ایک گروہ زمین پہ بیٹھا ہوتا، آہ کیو درمیان میں سینڈوچ بنا ہوتا، اس کا چہرہ پسینے میں شرابور ہورہا ہوتا، اور اس کی آواز چلّانے میں سب سے اونچی ہوتی:

''سبز ڈریگن پر چار سو!''۔

''ارے، کھولو!''۔ جواری کا چہرہ بھی پسینے میں شرابور ہوتا، باکس کھولتا اور پکار اٹھتا: ''آسمانی گیٹ!............۔

''............ایک سو............ایک سو پچاس''۔

اس چیخ کی دُھن میں، آہ کیو کا پیسہ رفتہ رفتہ دوسرے ہانپتے ہوئے لوگوں کی جیبوں میں جا جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ مجمع میں سے اپنا راستہ بنا کر باہر نکلنے اور پیچھے سے کھیل کو بہت دلچسپی سے دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے، جب تک کہ یہ مکمل طور پر ختم نہیں ہو جاتا۔ تب وہ بادل ناخواستہ سرپرست دیوتا کے مندر واپس ہو جاتا۔ اور اگلے دن وہ سوجھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کام پر چلا جاتا۔

جلد ہی وہ سو چکا۔

البتہ ''بدقسمتی، بھیس بدلی ہوئی ایک نعمت ہو سکتی ہے'' والی ضرب المثل کی سچائی اُس وقت نظر آتی جب آہ کیو جیت جانے والا بدقسمت ہوتا اور آخر میں شکست کھا جاتا۔

یہ وی چوآنگ میں ''دیوتاؤں کے میلہ'' کی شام تھی۔ روایت کے مطابق ایک ڈرامہ کھیلا جاتا۔ اور رواج ہی کے مطابق سٹیج کے قریب جوئے کی بے شمار میزیں موجود تھیں۔ ڈرامے کی گھنٹیاں اور ڈھول کی آوازیں آہ کیو سے تین میل دور تھیں جس کے کان صرف جواریوں کے نعرے سنتے تھے۔ وہ بار بار کامیابی سے جوا کھیلتا رہا، اس کے کاپر کے سکے چاندی کے سکوں میں بدلتے رہے، اُس کے چاندی کے سکے ڈالروں میں بدلتے رہے، اور اُس کے ڈالروں کا ڈھیر بلند ہوتا گیا۔ جذبات میں وہ چیخا ''آسمانی گیٹ پہ دو ڈالر!''۔

اسے بالکل پتہ نہ چلا کہ لڑائی شروع کس نے کی تھی، نہ یہ کہ، کس وجہ سے شروع ہوئی تھی۔ بددعاؤں، ضربوں اور ٹھوکروں کی آوازیں اس کے سر میں ایک کنفیوز دُھن پیدا کر رہی تھیں، اور جب تک وہ ڈگمگاتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکا تو اس وقت تک جوئے کی میزیں اٹھ چکی تھیں اور جواری جا چکے تھے۔ اس کے جسم کے کئی حصے درد کرتے محسوس ہوئے، جیسے کہ اسے بہت ٹھوکریں ماری گئی ہوں۔ جبکہ کئی لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہاں کچھ غلط ہو چکا تھا، وہ سرپرست دیوتا کے مندر واپس آیا، اور جس وقت اس نے دوبارہ ہوش سنبھالا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا ڈھیر ڈالروں کا غائب تھا۔ چونکہ میلے میں جوئے کی میزوں کو چلانے والے اکثر لوگ وی چوانگ کے مقامی باشندے نہ تھے اس لیے وہ مجرموں کو بھلا کیسے ڈھونڈ سکتا تھا؟۔

چاندی کا ڈھیر کس قدر سفید اور چمکدار ہوتا ہے! وہ سب اُس کا تھا............مگر اب وہ غائب ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں لٹنے کا تصور بھی اسے آرام نہ دے سک رہا تھا۔ خود کو کیڑا تصور کرنے سے بھی اسے چین نہیں مل رہا تھا۔ اس بار اس نے واقعتاً شکست کی تلخی جیسا ذائقہ چکھا۔

مگر اب اس نے شکست کو فتح میں بدل دیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور زور سے اپنے چہرے دو سخت تھپڑ رسید کیے، اس قدر زوردار کہ یہ درد سے جلنے لگا۔ اس تھپڑ بازی سے اس کا دل ہلکا ہو گیا۔ اس لیے کہ اسے ایسے لگا کہ جس نے اُسے تھپڑ مارے وہ خود تھا۔ ایک نے کسی دوسرے وجود کو تھپڑ مارے ہوں اور جلد ہی یہ یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کسی اور کو پیٹا............اس حقیقت کے باوجود کہ اس کا چہرہ ابھی تک درد سے جل رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر لیٹ گیا کہ اُس نے فتح حاصل کر لی۔

جلد ہی وہ سو گیا۔

باب سه

آہ کیو کی فتوحات کی ایک اور تفصیل

گو کہ آہ کیو ہمیشہ فتوحات حاصل کر رہا تھا، مگر وہ مشہور اُس وقت ہوا جب مسٹر چاؤ نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارنے کی مہربانی کی۔

سرکاری افسر کو دو سو نقد کی ادائیگی کے بعد وہ ناراضگی سے لیٹ گیا۔ بعد میں اس نے خود سے کہا، ''آج کل دنیا کو ہو کیا گیا ہے، بیٹے اپنے والدین کو پیٹ رہے ہیں ....''۔ پھر اس نے مسٹر چاؤ کے وقار کے بارے میں سوچا، جو کہ اب اُس کا بیٹا تھا، رفتہ رفتہ اس کی طبیعت اچھی ہوتی گئی، اور پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ''نوجوان بیوہ اپنے خاوند کی قبر پہ'' گاتا ہوا شراب خانے گئی۔

اس واقعہ کے بعد، عجیب بات ہے، سچ ہے کہ ہر شخص اسے غیر معمولی عزت دیتے محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے شاید اس کو اس حقیقت سے منسوب کیا کہ وہ مسٹر چاؤ کا باپ تھا، مگر اصل میں بات یہ نہ تھی ۔ وی چوانگ میں اصولی طور پر، ساتواں بچہ آٹھویں بچے کو مارتا، یا لی ....، چانگ.........کو پیٹتا تو اسے سنجیدہ نہیں لیا جاتا۔ پٹنے کو دیہات کے لوگ اس وقت گفتگو کا موضوع بنانے کا سوچتے تھے اگر وہ مسٹر چاؤ جیسی کسی اہم شخصیت کی طرف سے منسلک ہوتا۔ مگر ایک بار جب وہ اسے گفتگو کا موضوع بنانے کا سوچتے اس لیے کہ پیٹنے والا مشہور تھا، پٹنے والا اُس کی شہرت کا منعکس حصہ انجوائے کرتا۔ جہاں تک آہ کیو کے قصوروار ہونے کا تعلق ہے تو وہ تو سو فیصد درست سمجھا گیا اس لیے کہ مسٹر چاؤ تو غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اگر آہ کیو غلط تھا تو پھر ہر شخص اسے غیر معمولی عزت کیوں دے رہا تھا؟۔ یہ واضح کرنا مشکل ہے۔ ہم یہ تھیوری پیش کر سکتے ہیں کہ اس لیے کہ آہ کیو نے کہا تھا کہ وہ اُسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس سے مسٹر چاؤ ہے۔ لہٰذا گو کہ وہ پیٹا جا چکا تھا، لوگ ابھی تک خوفزدہ تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے کہیں سچ نہ ہو۔ اس لیے اس کے ساتھ زیادہ عزت سے سلوک کرنے میں سلامتی تھی۔ یا، متبادل طور پر، یہ کنفیوشس کے مندر میں قربانی کی گائے کے گوشت کے معاملے کی طرح تھا۔ گو کہ گائے کا گوشت اس کیٹیگری سے تھا جس سے کہ قربانی کے سور

اور دنبے کے گوشت کا تھا، کہ وہ سب جانوروں کا گوشت تھا، بعد میں کنفیوشس کے ماننے والے اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے اس لیے کہ اُس کا گوشت اِسی ولی کو پسند تھا۔

اس کے بعد آہ کیو کئی سال تک پھلتا پھولتا رہا۔

ایک موسم بہار کو جب وہ نشاط آمیز نشے میں چہل قدمی کر رہا تھا اس نے ایک دیوار کے ساتھ دھوپ میں بیٹھے کمر تک ننگے وسکر زوانگ کو دیکھا۔ اس منظر سے اس کا اپنا بدن خارش کرنے لگا۔ چونکہ وسکر وانگ خارش زدہ تھا اس لیے سب لوگ اسے ''رِنگ ورم وسکر وانگ'' پکارتے تھے۔ گو کہ آہ کیو نے لفظ ''رنگ ورم'' کو خارج کر دیا تھا، وہ اس کی بہت توہین کرتا تھا۔ آہ کیو نے محسوس کیا کہ خارش کے داغ کوئی استثنائی نہ تھے، مگر اس قدر گھنے بالوں والے گال واقعتاً اجنبی تھے اور وہ حقارت کے علاوہ کچھ اور اکساتے نہ تھے۔ چنانچہ آہ کیو اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اگر وہ کوئی اور آوارہ ہوتا تو آہ کیو اس قدر بے پرواہی سے بیٹھنے کی جرات نہ کرتا۔ مگر وسکرز وانگ کے قریب بیٹھنے سے کیا خوف؟۔ سچی بات یہ ہے کہ وانگ کے قریب بیٹھنے کی اس کی خواہش وانگ کے لیے عزت کی بات تھی۔

آہ کیو نے اپنی پھٹی پرانی، لکیروں والی جیکٹ اتار دی اور اُلٹا کر کے اس کا اندر باہر کر دیا۔ مگر چونکہ اسے یا تو اس نے اسے حال ہی میں دھویا تھا یا وہ بہت اناڑی تھا، ایک لمبی تلاش کے بعد اسے محض تین یا چار جوئیں ملیں۔ اس نے دیکھا کہ دوسری طرف وسکرز وانگ تیزی سے ایک کے بعد ایک جوں پکڑتا اور انہیں اپنے منہ میں ایک کڑک کی آواز کے ساتھ کچلتا جاتا۔

آہ کیو کو پہلے مایوسی محسوس ہوئی اور پھر وہ آزردہ ہوا۔ حقیر وسکرز وانگ نے اتنی زیادہ پکڑیں اور اس نے خود چند.........کتنی کم مائیگی کی بات ہے!۔ وہ ایک یا دو بڑے جوں پکڑنے کی جدوجہد کرتا رہا، مگر وہ نہ ملیں۔ اور بہت مشکل سے وہ درمیانہ سائز والی ایک پکڑ سکا جو اس نے اپنے منہ میں بہت زور اور وحشیانہ انداز سے ڈالا کیا۔ مگر اس نے محض ایک چھوٹی بے کار سی آواز پیدا کی، جو کہ وسکرز وانگ کی پیدا کردہ آوازوں سے حقیر آواز تھی۔

آہ کیو کے سارے نشاں سرخ ہو گئے۔ اپنی جیکٹ زمین پر گراتے ہوئے، اس نے تھوکا

اور بولا ''بالوں والا کیڑا!''۔

''خارشی کتے، کس کو گالی دی؟'' وسکرز وانگ نے توہین آمیز نگاہوں سے اوپر دیکھا۔

گو کہ حالیہ برسوں میں نسبتاً زیادہ عزت نے آہ کیو کا تکبر کچھ بڑھا دیا تھا، مگر جب ایسے لوفروں سے سامنا ہوتا جو لڑنے کے عادی تھے، تو وہ ذرا ڈرپوک پڑ جاتا۔ البتہ اِس موقع پر وہ غیر معمولی طور پر جھگڑالو محسوس کر رہا تھا۔ ایسا بالوں بھرے گالوں والی مخلوق کو اس کی توہین کی جرات کیسے ہو رہی تھی؟۔

''جس کسی کو بھی یہ نام فٹ آتا ہے''۔ آہ کیو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہاتھ کمر پہ تھے۔

''کیا تمہاری ہڈیوں کو خارش ہو رہی ہے؟'' وسکر وانگ نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے، اور اپنا کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

یہ سوچتے ہوئے کہ وانگ بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے، آہ کیو آگے بڑھا اور اُس پر اپنا مکّہ تان لیا۔ مگر اس سے قبل کہ اُس کا مکا نیچے آئے، وسکر وانگ نے پہلے ہی اسے دبوچ لیا اور اُسے ایسا جھٹکا دے کر کھینچا کہ وہ چکرا گیا۔ وسکر وانگ نے آہ کیو کی چوٹی پکڑ لی اور اس کا سر دیوار سے ہمیشہ کی طرح مارنے کے لیے دیوار کی طرف گھسیٹا۔

''ایک شریف آدمی اپنے ہاتھوں کے بجائے زبان استعمال کرتا ہے''۔ آہ کیو نے کہا، یوں کہ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔

بظاہر وسکرز وانگ شریف آدمی نہ تھا، اس لیے کہ آہ کیو کی بات کا کوئی نوٹس لیے بغیر اُس نے لگاتار پانچ بار آہ کیو کے سر کو دیوار پہ دے مارا، اور اسے ایک زوردار دھکا لگایا جو اسے دو گز تک ڈگمگاتا لے گیا۔ پھر کہیں جا کر وسکرز وانگ کی تسلی ہوئی۔

جہاں تک آہ کیو کو یاد تھا، یہ زندگی میں اس کی اولین توہین تھی، اس لیے کہ وہ ہمیشہ وسکرز وانگ کو چڑاتا رہا تھا کہ اس کے بدصورت بالوں والے گال تھے، مگر آج تک خود بے عزت نہ ہوا تھا، اور اس سے پٹا بھی نہ تھا۔ اور اب، تمام توقعات کے برعکس وسکرز وانڈ نے اسے پیٹا تھا۔ وہ

منڈی میں جو کہتے تھے شاید صحیح تھا کہ ''بادشاہ نے سرکاری امتحانات ختم کر دیے۔ اس لیے سکالروں کی اب ضرورت نہ تھی، اس کے نتیجے میں چاؤ خاندان کا وقار ضرور ختم ہوا تھا''۔ کیا اِس وجہ سے بھی لوگ اُس سے توہین سے ہمیشہ آ رہے تھے؟۔

آہ کیو وہاں متذبذب کھڑا تھا۔

دور سے آہ کیو کا ایک اور دشمن نظر آیا۔ یہ مسٹر چئین کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اُس سے بھی آہ کیو نفرت کرتا تھا۔ شہر میں ایک غیر ملکی سکول میں تعلیم پانے کے بعد لگتا تھا کہ وہ جاپان گیا تھا۔ جب وہ چھ ماہ بعد واپس آیا تو اس کی چال چینیوں کی سی نہ تھی۔ اور اس کے سر سے بالوں کی چوٹی غائب تھی۔ اس کی ماں ایک درجن بار زار و قطار روئی، اور اس کی بیوی نے تین بار کنوئیں میں کود جانے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں اس کی ماں نے ہر کسی کو بتایا ''اُس کی چوٹی کچھ بدمعاشوں نے اُس وقت کاٹ لی جب وہ نشے میں دُھت تھا۔ وہ ایک افسر بن چکا ہوتا، مگر اب اُسے چوٹی کے دوبارہ اگ کر بڑی ہونے تک انتظار کرنا ہوگا''۔ آہ کیو کو بہر حال اس بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ اسے ''غیر ملکی شیطان'' اور ''غیر ملکی تنخواہ پر غدار'' پکارنے پر اصرار کرتا رہا۔ جونہی وہ اسے دیکھتا تو زیرِ لب اُسے برا بھلا کہنے لگتا۔

جو چیز آہ کیو کو سب سے بری لگتی تھی وہ اس کی مصنوعی چوٹی تھی۔ جب چوٹی ہی مصنوعی ہو تو وہ آدمی بھلا انسان کیوں سمجھا جانے لگے۔ اور یہ حقیقت کہ اس کی بیوی نے چوتھی بار کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی تھی اس بات کی غماز تھی کہ وہ بھی ایک اچھی عورت نہ تھی۔

اب وہی ''غیر ملکی شیطان'' قریب آ رہا تھا۔

''گنجے سر کا............احمق'' ماضی میں آہ کیو زیر لب سنائی نہ دینے والے انداز میں اُسے گالی دیتا۔ مگر آج چونکہ وہ بہت غصے میں تھا اور اپنے جذبات کا اظہار چاہتا تھا، غیر ارادی طور پر یہ الفاظ سے اس کے منہ سے پھسل گئے۔

بدقسمتی سے ''گنجے سر'' والے کے ہاتھ میں ایک چمکدار بھورے رنگ کی سوٹی تھی جسے آہ کیو ''ایک نوحہ گر کے ہاتھ میں سوٹی'' کہتا تھا۔ چھلانگتا ہوا وہ آہ کیو پر جھپٹ پڑا جو کہ یک دم سمجھ گیا

کہ مار اُس پہ منڈلا رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی خود سکیڑ لیا۔ اس نے سخت ہوتی ہوئی پیٹھ کے ساتھ انتظار کیا۔ بالکل ایسا ہوا۔ ٹھاک، کی آواز آئی جو لگا کہ اس کے سر پر نازل ہوئی۔ ''میں نے تو اُس کو کہا''۔ آہ کیو نے پاس کھڑے ایک بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹھاک، ٹھاک، ٹھاک!

آہ کیو کو جہاں تک یاد پڑتا تھا، یہ اس کی زندگی کی دوسری بے عزتی تھی۔ خوش قسمتی سے جب ٹھاک ٹھاک ختم ہوا تو اُسے ایسا لگا جیسے معاملہ ختم ہو گیا، اور وہ تو حتیٰ کہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ مزید برآں آباؤ اجداد کی طرف سے وراثت میں ملی ''بھول جانے کی قیمتی اہلیت'' نے اسے اچھی حالت میں رکھا۔ وہ آہستہ سے روانہ ہوا اور جب تک وہ شراب خانے کے دروازے تک پہنچ چکا تو وہ دوبارہ خوش تھا۔

البتہ، بالکل اُسی وقت ''خود سدھار'' کانونٹ سے ایک چھوٹی راہبہ چلتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ کسی راہبہ کا نظر آجانا آہ کیو کو ہمیشہ اُسے چھیڑنے پر اکساتی، بالخصوص اُس کی بے عزتی کے بعد۔ جب اُسے یاد آیا کہ ابھی ابھی اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا، تو اس کا سارا غصہ دوبارہ جی اٹھا:

''اچھا تو آج کی میری ساری بدقسمتی اس لیے آئی تھی کہ میں نے تجھے دیکھنا تھا!''۔ اُس نے سوچا۔

وہ اُس کے پاس گیا اور بلند آواز میں تھوکا ''آخ، تھو!''۔

چھوٹی راہبہ نے ذرا بھی توجہ نہ دی اور حسبِ سابق سر جھکائے چلتی رہی۔ آہ کیو اُس کے پاس چلا گیا اور اُس کے تازہ ٹنڈ کیے سر پر ایک تھپڑ دے ماری، اور پھر احمقانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا ''گنجی، جلدی واپس جاؤ، تمہارا پادری تمہارا انتظار کر رہا ہے............''۔

''تم کس کے ساتھ بدتمیزی کر رہے ہو؟............'' سرخ ہوتی ہوئی راہبہ نے قدم تیز کرتے ہوئے کہا۔

شراب خانے میں موجود لوگ قہقہوں میں غلطاں ہوئے۔ جب آہ کیو نے دیکھا کہ اُس کے اس اقدام کی تعریف ہو رہی ہے تو وہ تو پھول گیا۔

''اگر پادری تمہارے ساتھ بدتمیزی کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں؟''۔ اس نے اس کی گال پر چونڈی دیتے ہوئے کہا۔

شراب خانے میں موجود لوگ پھر قہقہہ لگانے لگے۔ آہ کیو مزید خوش ہوا اور اُن لوگوں کو خوش کرنے کے لیے جو اس کی حرکتوں کو منظوری دے رہے تھے، اس نے اُس کے جانے سے پہلے اس ایک اور زور کی چونڈی دی۔

اس واردات کے دوران وہ وسکرز وانگ اور غیر ملکی شیطان کو پہلے ہی بھول چکا تھا، جیسے اس نے سارے دن کی بدقسمتی کا بدلہ لے لیا تھا۔ حیرت تو یہ تھی کہ وہ مار کھانے کے بعد اور زیادہ مطمئن تھا، وہ اس قدر ہلکا پھلکا اور زندہ دل لگ رہا تھا جیسے کہ ہوا میں اڑنے والا ہو۔

''آہ کیو، تمھیں بے اولاد (بے بیٹا) موت آجائے''۔ دور سے چھوٹی راہبہ کی روہانسی آواز آئی۔

آہ کیو مسرت بھرے قہقہے لگا رہا تھا۔

شراب خانے میں موجود لوگ بھی زور زور سے ہنس رہے تھے۔

باب چار

محبت کی ٹریجڈی

کہتے ہیں کہ کچھ فاتح ایسے ہوتے ہیں جو اُس وقت تک اپنی فتح سے خوش نہیں ہوتے جب تک کہ ان کا مخالف شیر اور عقاب کی طرح خونخوار نہ ہو۔ اگر اُن کے دشمن بھیڑ یا مرغی کی طرح بزدل ہوں تو اُن کو اپنی فتح خالی نظر آتی ہے۔ کچھ فاتح ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دشمن کو تہہ تیغ یا مطیع بنا کر اور خالص محکومیت میں جھکا کر، احساس کر لیتے ہیں کہ اب ان کا کوئی دشمن، مخالف، یا دوست باقی نہیں بچا............ بس صرف وہ ہی وہ ہیں، سپریم، واحد، مایوس اور خطرناک۔ اور پھر وہ اپنی فتح کو ایک ٹریجڈی دیکھتے ہیں۔ مگر ہمارا ہیرو اس قدر بے حس نہ تھا۔ یہ بقیہ دنیا پہ چین کی اخلاقی بالادستی کا

ایک ثبوت ہوسکتا ہے۔

آہ کیو کو دیکھیے جو ہلکا پھلکا ہے اور خوشی سے پھولا نہیں سماتا، جیسے ابھی ابھی اڑان بھرنے والا ہو۔

البتہ یہ فتح عجیب نتائج کے بغیر نہ تھی۔ کافی وقت تک اس نے خود کو اڑتا ہوا محسوس کیا، اور وہ سرپرست دیوتا کے مندر کے اندر اڑا، جہاں وہ عموماً لیٹے ہی خراٹے لینے لگتا۔ مگر، اِس شام اسے آنکھیں بند کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا، اس لیے کہ اسے یوں لگا جیسے اُس کے انگوٹھے اور پہلی انگلی میں کوئی مسئلہ ہو جو لگتا تھا ہر وقت کی بہ نسبت زیادہ نرم لگ رہا تھا۔ یہ کہنا تو ناممکن تھا کہ آیا چھوٹی راہبہ کے چہرے پہ کوئی نرم اور ہموار چیز تھی جو اُس کی انگلیوں سے چپک گئی تھی، یا یہ کہ اس کی انگلیاں اُس کی نرم اور ہموار گالوں سے چھو گئی تھیں۔

''آہ کیو تم بے بیٹا مر جاؤ''۔

یہ الفاظ آہ کیو کے کانوں میں بجنے لگے، اور اس نے سوچا'' بالکل صحیح ہے۔ مجھے ایک بیوی کرنی چاہیے، اس لیے کہ اگر ایک شخص بغیر بیٹا مر جائے تو اُس کی روح کی خاطر چاول کا ایک پیالہ خیرات کرنے والا تک کوئی نہ ہوگا.......... مجھے ایک بیوی کرنی چاہیے''۔ اور یہ زندگی کی ٹریجڈیوں میں سے ایک ہے کہ'' وارثوں کے بغیر روح بھوکی رہے''۔ چنانچہ اس کے خیالات داناؤں اور ولیوں کی تعلیمات کے عین مطابق تھے۔

''عورت، عورت!..........''۔ اس نے سوچا۔

''.......... پادری بدتمیزی کرتا ہے..........عورت، عورت..........عورت!'' اس نے دوبارہ سوچا۔

ہمیں کبھی معلوم نہ ہوگا کہ اُس رات آہ کیو کس وقت سویا۔ البتہ اُس کے بعد اسے شاید ہمیشہ اپنی انگلیاں نرم اور ہموار تر محسوس ہوئی ہوں گی اور وہ ہمیشہ ذرا سا مسرور رہا۔'' عورت ....''۔ وہ سوچتا رہا۔

اس سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ عورت انسانیت کے لیے ایک وبال ہے۔

چینی مرد، ولی اور دانا بن سکتے تھے اگر یہ بدقسمت حقیقت موجود نہ ہوتی کہ انہیں عورتیں برباد کر دیتی ہیں۔ بارہویں صدی قبل مسیح، شانگ سلطنت اُس کے آخری بادشاہ کی داشتہ'' تا چائی'' سے تباہ ہوئی تھی، آٹھویں صدی قبل مسیح، میں چاؤ سلطنت کو اُس کے آخری بادشاہ کی'' پاؤ ژؤ'' نے ذلیل کیا تھا۔ جہاں تک چن سلطنت کی بات تھی تو گو کہ اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں، پھر بھی اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ سلطنت کسی عورت کی وجہ سے ختم ہوگئی تو ہم غلط نہ ہوں گے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں تنگ چاؤ کی موت اُس کی داشتہ تیاؤ چان کی وجہ سے ہوتی تھی۔

آہ کیو بھی شروع میں سخت اخلاقیات والا شخص تھا۔ گو کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ آیا اسے کسی اچھے استاد کی ہدایت حاصل تھی یا نہیں، لیکن وہ'' مرد اور زن کو سختی کے ساتھ الگ الگ رکھنے'' کے معاملے میں ہر وقت خود کو سختی کے ساتھ پیروی کرتا دکھاتا۔ اور چھوٹی راہبہ اور غیر ملکی شیطان جیسے کافروں کی مذمت کرنے پر خود کو ہمیشہ برحق جتلاتا۔ اس کا نقطۂ نظر، یہ تھا: ساری راہبائیں پادریوں سے خفیہ تعلقات میں ہیں۔ جب ایک عورت اکیلی گلی میں چلتی ہے تو وہ یقیناً برے مردوں کو بے عصمت کرنا چاہتی ہے۔ جب ایک مرد اور عورت آپس میں بات کرتے ہوں تو وہ لامحالا خفیہ ملاقات طے کر رہے ہوتے ہیں''۔ ایسے لوگوں کو سیدھا کرنے کے لیے وہ دہشتناک انداز میں آن دھمکتا، بلند اور کاٹ ڈالنے والے فقرے کستا، اور اگر وہ جگہ سنسان ہوتی تو پیچھے سے ایک چھوٹا پتھر پھینکتا۔

وہ بتا سکتا تھا کہ تیس برس کی عمر میں اس کا سر گھوم سکتا ہے جس طرح اِس چھوٹی راہبہ پر اس کا ماتھا گھوما تھا۔ پرانے کلاسیکل مذہبی فتوؤں کے مطابق اس طرح کا سرور سب سے زیادہ قصوروار ہے، چنانچہ عورت بلاشبہ قابلِ نفرت ترین جانداروں میں سے ہے۔ اس لیے کہ اگر چھوٹی راہبہ کا چہرہ ہموار اور نرم نہ ہوتا تو آہ کیو اُس سے جادو نہ ہوتا، نہ ہی اس طرح ہوتا اگر چھوٹی راہبہ کا چہرہ ایک کپڑے سے ڈھنپا ہوتا۔ پانچ یا چھ برس قبل جب ایک اوپیرا دیکھتے ہوئے اُس نے اوپیرا بین ایک عورت کی ٹانگ کو چونڈی کاٹی تھی، بلکہ اس لیے کہ اُسے اس سے اُس عورت کی شلوار کے

کپڑے نے الگ کیا تھا تو بعد میں اُسے سرور محسوس نہیں ہوا تھا۔ چھوٹی راہبہ نے منہ نہیں ڈھانپا ہوا تھا۔ یہ اس ملحد کے قابل نفرت ہونے کا دوسرا ثبوت تھا۔

''عورت............'' آہ کیو نے سوچا۔

وہ اُن عورتوں کو گہری نگاہ سے تکتا رہتا جو اُس کے خیال میں ''برے مرد کو بے عصمت کرنا چاہ رہی ہیں''، مگر وہ اُس پر نہ مسکراتی تھیں۔ وہ اُن عورتوں کو بہت غور سے سنتا جو اُس سے بات کرتی تھیں، مگر اُن میں سے ایک نے بھی اس سے ایک خفیہ ملاقات کا اشارہ تک نہ دیا۔ آہ! یہ عورتوں کی قابلِ نفرت ہونے کی ایک اور مثال تھی۔ وہ سب کی سب ایک نقلی انکساری اختیار کرتی تھیں۔

ایک روز جب آہ کیو، مسٹر چاؤ کے گھر میں چاول پیس رہا تھا، وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد چلم پینے باورچی خانہ میں بیٹھ گیا۔ اگر یہ کسی اور کا گھر ہوتا تو وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے گھر چلا جاتا مگر چاؤ گھرانے میں رات کا کھانا بہت سویرے کھایا جاتا تھا۔ گو کہ یہ قانون تھا کہ کھانا کھانے کے بعد لیمپ جلائے بغیر سونے چلے جائیں مگر اِس قانون میں کبھی کبھار کی کچھ استثنائیں ہوتی تھیں: مسٹر چاؤ کے بیٹے کو کاؤنٹی امتحان پاس کرنے سے پہلے اجازت تھی کہ وہ لیمپ جلا کر امتحان کی تیاری کرے، اور جب آہ کیو کام کرنے آجاتا تو اسے لیمپ جلا کر چاول پینے کی اجازت تھی۔ قانون میں اس ثانی الذکر استثنا کی وجہ سے آہ کیو کام شروع کرنے سے پہلے ابھی تک باورچی خانہ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔

جب چاؤ گھرانے کی واحد نوکرانی آماہ وو نے برتن دھو لیے تو وہ بھی لمبی بنچ پر بیٹھ گئی اور آہ کیو سے باتیں کرنے لگی:

''ہماری مالکن نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا اس لیے کہ مالک ایک داشتہ لانا چاہتا ہے............''۔

''عورت............اماہ وو............ یہ چھوٹی بیوہ'' آہ کیو نے سوچا۔

''ہماری چھوٹی مالکن چاند کی آٹھ کو بچہ پیدا کرنے والی ہے............''۔

''عورت............'' آہ کیو نے سوچا۔

اس نے چلم نیچے رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

''ہماری چھوٹی مالکن............'' آماہ وو بات جاری کیے تھی۔

''میرے ساتھ سو جاؤ!'' آہ کیو اچانک آگے کی طرف بھاگا اور خود کو اس کی قدموں میں گرا دیا۔

مکمل خاموشی کا ایک لمحہ۔

''آئی، یاہ!'' اماہ وو ایک لمحہ کے لیے ہکا بکا رہ گئی، پھر اچانک کانپنے لگی، پھر چیختی ہوئی باہر نکلی۔ اُس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ آہ کیو بھی دیوار کی طرف سجدہ ریز ہکا بکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے خالی بنچ کا سہارا لیا اور آہستگی سے اٹھ کھڑا ہو گیا، اسے ذرا سا اندازہ تھا کہ غلطی ہو گئی۔ اصل میں، اِس وقت تک وہ خود بھی ہیجانی کیفیت میں تھا۔ ایک ہیجان میں اس نے چلم اپنے نیفے کے ساتھ اڑس لیا اور واپس چاول کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

مگر............ ٹھاک............ اُس کے سر پر ایک بھاری ضرب لگ گئی، وہ چکرا گیا۔ سامنے کامیاب کاؤنٹی امیدوار بانس کا ایک بڑی ڈانگ تھامے کھڑا تھا۔

''تمہاری یہ جرات؟............''۔

بانس کی ڈانگ آہ کیو کے کندھے پر آن رہی۔ اور جب اس نے خود کو بچانے کے لیے دونوں ہاتھ اوپر کیے تو ضرب اُس نے ہاتھ کے ٹخنے پر پڑی اور اسے بے حد درد ہوا۔ جب وہ کچن کے دروازے سے بھاگ نکلا تو لگا کہ اس کی پیٹھ نے بھی ایک ضرب کھا لی۔

''کچھوے کا انڈا!'' کامیاب امیدوار چیخا، وہ اُس کے پیچھے سے اُسے لعنتوں بد دعاؤں سے پھٹکار رہا تھا۔

آہ کیو فرش کو بھاگا جہاں وہ اکیلا کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک ہاتھ کے ٹخنوں پہ درد محسوس کر رہا تھا اور ابھی تک ''کچھوے کا انڈا'' یاد کر رہا تھا اس لیے کہ یہ لفظ گاؤں میں کبھی بھی استعمال نہ ہوتا تھا بلکہ صرف وہ امیر لوگ یہ لفظ استعمال کرتے تھے جن کا سرکار سے تعلق ہوتا تھا۔ اُس نے اسے مزید

خوفزدہ کر دیا اور اُس کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا۔ البتہ اب اس کے ذہن سے ”..........عورت“ ہوا ہو چکی اور لعن طعن کے بعد لگتا تھا کہ کوئی چیز ختم ہو چکی ہے اور اس نے مسرور ہو کر دوبارہ چاول پیسنے شروع کیے۔ کچھ وقت تک پسپائی کے بعد وہ گرم ہو گیا، اور اپنی قمیص اتارنے کو پسپائی روک دی۔

جس وقت وہ قمیص اتار رہا تھا، اُسے باہر شور سنائی دی۔ اور چونکہ آہ کیو ہمیشہ کسی جاری پر جوش واقعہ میں شامل ہونا پسند کرتا تھا، وہ آواز کی سمت کو باہر نکلا۔ اسے یہ شور مسٹر چاؤ کے احاطے کے اندر سنائی دی۔ گو کہ اندھیرا ہو رہا تھا پھر بھی اُسے وہاں کئی لوگ نظر آئے۔ سارا چاؤ خاندان جمع تھا بمع مالکن کے جس نے دو دن سے کچھ نہ کھایا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں اُن کی پڑوسن مسز تساؤ بھی تھی، اُن کے رشتہ دار چاؤ پائی ین اور چاؤ سوچن بھی۔

چھوٹی مالکن آماہ وو کو سرونٹ کوارٹرز سے یہ کہتے ہوئے باہر نکال رہی تھی ”باہر آؤ..........تم اپنے کمرے میں شرمندگی میں نہ رہو“۔

”ہر کوئی جانتا ہے کہ تم ایک اچھی عورت ہو“۔ باہر سے مسز تساؤ نے کہا ”تمہیں خودکشی کرنے کا نہیں سوچنا چاہیے“

آماہ وو بس ماتم کر رہی تھی، کچھ بڑبڑا رہی تھی جسے کوئی سمجھ نہ پا رہا تھا۔

”یہ دلچسپ ہے“ آہ کیو نے سوچا ”یہ چھوٹی بیوہ کیا کرنے والی ہے؟“۔ وہ یہ معلوم کرنے چاؤ سوچن کے قریب آ رہا تھا کہ اس کی نظر مسٹر چاؤ کے بڑے بیٹے پر پڑی جو بانس کی ڈانگ تھامے اُس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ بانس کی اس بڑی ڈانگ کو دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ اُسی سے اس پہ مار پڑی تھی۔ اور اسے احساس ہوا کہ پر جوشی کے اس معاملے میں وہ کسی طرح منسلک ہے۔ وہ مڑا اور دوڑ اپڑا، اس امید میں کہ فرش تک نکل پائے گا۔ اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ بانس کی ڈانگ اس کی پسپائی کو کاٹ دے گی۔ تو وہ مڑا اور دوسری سمت میں بھاگا، پچھلے دروازے کو۔ مختصر وقت میں وہ پھر سر پرست دیوتا کے مندر میں تھا۔

وہاں ذرا سا بیٹھنے کے بعد اس کی جلد نے انگور جیسے دانے بنانے شروع کیے اور اسے سردی محسوس ہوئی۔ اس لیے کہ گو کہ یہ بہار تھا مگر راتیں ابھی تک یخ بستہ تھیں اور ننگی پیٹھ کے لیے

مناسب نہ تھیں۔ اسے یاد آیا کہ وہ اپنی قمیص چاؤ کے گھر چھوڑ آیا مگر اُسے ڈر تھا کہ اگر وہ اسے لینے گیا تو کہیں اُسے بانس کی ڈانگ دوبارہ نہ چکھنی پڑے۔

پھر سرکاری افسر اندر آیا۔

”لعنت ہو تم پہ آہ کیو“۔ سرکاری افسر نے کہا ”تم چاؤ خاندان کے نوکروں کو بھی نہیں چھوڑتے، تم، باغی!! تم نے میری نیند خراب کر دی، لعنت ہو تم پہ..........“۔

گالیوں کی اس بوچھاڑ میں ظاہر ہے آہ کیو کچھ نہیں بول سکتا تھا۔ آخر میں چونکہ یہ رات کا وقت تھا، آہ کیو کو دگنی رقم دینی پڑی۔ اس نے سرکاری افسر کو چار سو دے دیے۔ مگر اس کے پاس چونکہ دینے کو نقد پیسے نہ تھے اس لیے اس نے ضمانت کے بطور اپنی ہیٹ اسے دے دی اور مندرجہ ذیل پانچ شرائط پر رضامند ہوا:

1۔ اگلی صبح آہ کیو کو ایک پونڈ وزن کی سرخ موم بتیوں کی جوڑی اور خوشبودار تیلیوں کا ایک بنڈل اپنی گناہ کے لیے کفارے کی خاطر چاؤ خاندان کو لے جانی ہوگی۔

2۔ آہ کیو کو تاؤ مذہب کے پنڈتوں کی ادائیگی کرنی ہوگی جن کو چاؤ خاندان نے بری روحوں کو بھگانے کے لیے بلایا تھا۔

3۔ آہ کیو دوبارہ کبھی چاؤ خاندان کے ہاں قدم نہیں رکھے گا۔

4۔ اگر آماہ وو کے ساتھ کوئی بدنصیبی ہو جائے تو آہ کیو کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔

5۔ آہ کیو اپنی اجرت مانگنے یا قمیص لینے وہاں نہیں جائے گا۔

ظاہر ہے آہ کیو ہر بات پہ رضامند ہو گیا مگر بدقسمتی سے اس کے پاس نقد پیسہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے یہ موسم بہار تھا۔ اس لیے رضائی کے بغیر اس کا گزارہ ہو سکتا تھا۔ جرمانے کے بعد بھی اس کے پاس کچھ پیسے بچے، لیکن سرکاری افسر سے اپنا ہیٹ واگزار کرنے کے بجائے اس نے ان پیسوں سے شراب پی۔

اصل میں چاؤ خاندان نے نہ تو خوشبو جلائے تھے نہ موم بتیاں، اس لیے کہ یہ اُس وقت استعمال ہو سکتی تھیں اگر مالکن مہاتما بدھ کی عبادت کرتی۔ چیتھڑے شدہ قمیص کے زیادہ بڑے حصے کو

اُس بچے کے ڈائپر کے بطور استعمال کیا گیا جو چاند کی آٹھ کو چھوٹی مالکن سے پیدا ہوا جبکہ وہاں سے بچی ہوئی قمیص کے ٹکڑوں کو آ ماہ وو نے جوتوں کے تلے کے لیے استعمال کیا۔

پانچواں باب

گزر بسر کا مسئلہ

چاؤ خاندان کی شرائط کو مانتے ہوئے اور جرمانہ ادا کرنے کے بعد آہ کیو حسبِ معمول سر پرست دیوتا کے مندر چلا گیا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور اسے محسوس ہوا کہ کوئی چیز گڑ بڑ ہے۔ محتاط فکر وسوچ نے اسے اس نتیجے پر پہنچایا کہ یہ شاید اس لیے ہے کہ اس کی پشت ننگی ہے۔ یہ یاد آتے ہی کہ اس کے پاس ابھی تک ایک خستہ حال لکیر دار جیکٹ ہے، اُس نے اُسے پہنا اور لیٹ گیا، اور جب اس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو مغربی دیوار پر پہلے ہی سورج چمک رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور کہا ''لعنت ہو............''۔

اٹھ جانے کے بعد وہ حسبِ معمول گلیوں میں گھومتا رہا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ کوئی اور گڑ بڑ ہے۔ گو کہ اس گڑ بڑ کا ایک ننگی پیٹھ کی طبعی بے آرامی سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بظاہر اُس دن کے بعد سے وی چوانگ کی ساری عورتیں آہ کیو سے شرمانے لگیں۔ جب بھی انہیں وہ نظر آ جاتا تو وہ گھروں کے اندر بھاگ جاتیں۔ اصل میں، حتیٰ کہ مسز تساؤ بھی جو تقریباً پچاس سال کی تھی، دوسروں کے ساتھ کنفیوژن میں اندر بھاگ گئی، اپنی گیارہ سالہ بیٹی کو اندر جانے کا کہتی ہوئی۔ یہ آہ کیو کو بہت عجیب لگا۔ ''کتیائیں!'' اس نے سوچا ''یہ اچانک نوجوان لیڈیز کی طرح باحیا بن گئی ہیں............''۔

بہت دنوں بعد، البتہ، اس نے زیادہ زور سے محسوس کیا کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ پہلے تو شراب خانے نے اُسے قرض دینے سے انکار کر دیا، پھر سر پرست دیوتا مندر کے بوڑھے انچارج نے کچھ جملے کسے، جیسے وہ چاہتا ہو کہ آہ کیو یہاں سے چلا جائے، اور تیسرا یہ کہ بہت دنوں سے............ کتنے

دنوں سے یہ اسے یاد نہ تھا............ایک شخص بھی اُسے مزدور کرنے نہ آیا۔ شراب خانے سے قرض نہ ملنے کا تو سمجھ میں آ سکتا تھا، اور اگر بوڑھا آدمی آہ کیو کو جانے کا کہہ رہا تھا تو اسے بھی نظر انداز کیا جا سکتا تھا مگر جب اُسے مزدور رکھنے کوئی نہیں آ رہا تھا تو اسے بھوکا رہنا پڑتا۔ اور یہ واقعی مصیبت کی بات تھی۔

جب آہ کیو کے برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ اصل حقیقت جاننے کے لیے اپنے ریگولر مالک کے گھر چلا گیا............اسے تو صرف مسٹر چاؤ کے گھر جانے کی اجازت نہ تھی۔ مگر اسے بہت ہی عجیب رویے کا سامنا ہوا۔ ایک مرد ظاہر ہوا جو بہت غصہ میں لگتا تھا اور اس نے آہ کیو کو ایسے دھتکارا جیسے وہ ایک بھکاری ہو:

''یہاں کچھ نہیں، بالکل کچھ نہیں، چلے جاؤ!''۔

اور آہ کیو کو بہت غیر معمولی لگتا گیا۔

''یہ لوگ ماضی میں ہمیشہ مدد چاہتے تھے'' اس نے سوچا ''وہ اچانک بدل گئے ہیں۔ یہ حیران کن لگتا ہے''۔ اور محتاط معلومات کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ جب اُن کے پاس کوئی چھوٹا موٹا کام ہوتا تو وہ ینگ ڈی کو بلاتے تھے۔ یہ ینگ ڈی ایک لاغر اور کمزور کنگال تھا جو کہ آہ کیو کی نظر میں وسکرز وانگ سے بھی حقیر تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ حقیر آدمی اُس سے اُس کا گزر بسر چرا لے گا؟۔ لہٰذا اس دفعہ آہ کیو کی تذلیل ہمیشہ سے زیادہ تھی، اور راہ چلتے ہوئے، غصہ سے کھولتے ہوئے، اس نے اچانک اپنا بازو اٹھایا اور گایا ''میں تمھیں فولادی ڈنڈے سے پیس ڈالوں گا............''۔

کچھ دن بعد وہ مسٹر چائن کے گھر کے سامنے ینگ ڈی سے واقعتاً مل گیا۔ ''جب دو دشمن ملتے ہیں تو اُن کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں''۔ جب آہ کیو اُس کی طرف گیا تو ینگ ڈی خاموش کھڑا تھا۔

''احمق گدھے!'' آہ کیو پھنکارنے لگا، غصے سے گھورتا ہوا اور منہ میں جھاگ اڑاتا ہوا۔

''میں ایک کیڑا مکوڑا ہوں............اس سے بات بنے گی؟............'' ینگ ڈی نے

پوچھا۔

اس طرح کی عاجزی تو آہ کیو کے غصے کو مزید بڑھاتی، مگر چونکہ اس کے ہاتھ میں کوئی فولادی ڈنڈا نہ تھا اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا تھا کہ اپنا بازو آگے لہراتا ہوا ینگ ڈی کی چٹیا پکڑنے جھپٹا۔ ینگ ڈی نے ایک ہاتھ سے اپنی چٹیا کو بچاتے ہوئے، دوسرے ہاتھ سے آہ کیو کو کی چٹیا پکڑنے کی کوشش کی، جبکہ آہ کیو نے بھی ایک فارغ ہاتھ خود اپنی چٹیا کی حفاظت کے لیے استعمال کیا۔ ماضی میں آہ کیو نے کبھی بھی ینگ ڈی کو سنجیدہ لینے کا سوچا تک نہ تھا، مگر چونکہ وہ حال میں بھوک سے گزر چکا تھا اس لیے وہ بھی اپنے مخالف جتنا لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ یوں وہ دونوں برابر والے مخالفوں کا نمونہ پیش کررہے تھے۔ چار ہاتھ دو، سروں کی طرف بڑھے، دونوں آدمی کمر تک جھکے ہوئے چی این خاندان کی دیوار پر آدھ گھنٹہ تک ایک نیلا قوسِ قزح جیسا سایہ ڈالتے رہے۔

''بس کرو، بس کرو''۔ تماشبینوں میں سے ایک بولا، وہ شاید اُن میں صلح چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے''۔ دوسرے بولے مگر یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ ان میں صلح چاہ رہے تھے، لڑاکوؤں کی حوصلہ افزائی کررہے تھے یا انہیں مزید ہمت کرنے کو اکسا رہے تھے۔

البتہ بھڑا ہوا جوڑا اُن کی باتیں سنی ان سنی کررہا تھا۔ اگر آہ کیو تین قدم پیش قدمی کرتا تو ینگ ڈی تین قدم پیچھے ہٹ جاتا، اور یوں وہ کھڑے ہوتے۔ اگر ینگ ڈی تین قدم کی پیش قدمی کرتا تو آہ کیو تین قدم پیچھے ہٹ جاتا، اور وہ پھر کھڑے ہوتے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد (وی چوآنگ میں چند کلاک تھے، اس لیے وقت بتانا مشکل ہے، ہوسکتا ہے یہ بیس منٹ ہوں) جب دونوں کے ہاتھوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور اُن کے چہروں سے پسینہ بہہ رہا تھا تو آہ کیو نے اپنے ہاتھ چھوڑے، اور اسی لمحے ینگ ڈی نے بھی ہاتھ چھوڑے۔ وہ بہ یک وقت سیدھا کھڑے ہوئے اور بہ یک وقت پیچھے ہٹے اور مجمع میں سے اپنا راستہ بنانے لگے۔

''جہنمی، میں تمہیں دوبارہ دیکھوں گا'' آہ کیو نے جاتے جاتے کہا۔

''جہنمی، میں تمہیں دوبارہ دیکھوں گا''۔ ینگ ڈی بازگشت کی طرح بولا۔

یہ جنگی جدوجہد بظاہر نہ فتح نہ شکست میں ختم ہوگئی اور یہ معلوم نہیں کہ تماشبین مطمئن ہوئے یا نہیں اس لیے کہ کسی نے کچھ نہ کہا۔ مگر پھر بھی آہ کیو کو مزدور بنانے کوئی نہ آیا۔

ایک گرم دن جب ایک سکون آور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا گرمی کو کچھ دھکیلنے لگا، آہ کیو کو دراصل سردی لگنی محسوس ہوئی، مگر وہ اس کو برداشت کرسکتا تھا، اُس کا تو سب سے اہم معاملہ خالی پیٹ تھا۔ اس کی روئی والی رضائی، ہیٹ اور قمیص بہت عرصے سے غائب تھے، اور اُس کے بعد وہ اپنا جیکٹ بیچ چکا تھا۔ اب اس کی شلوار کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا اور اسے تو وہ اتار نہیں سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے پاس ایک لکیردار جیکٹ تھی، مگر وہ تو بالکل ردی تھی ماسوائے اس کے کہ اُس سے جوتے کے تلے بنائے جائیں۔ اُسے ایک عرصے سے امید تھی کہ اسے سڑک پر بہت پیسے پڑے ملیں گے مگر ابھی تک اُسے کچھ نہیں ملا تھا۔ اُسے یہ امید بھی تھی کہ اچانک اسے اپنے پہلو بدلتے ہی کمرے میں پیسے پڑے ملیں گے، اور اس نے وحشیوں کی طرف چاروں طرف نظریں بھی دوڑائیں، مگر کمرہ تو بالکل خالی تھا۔ چنانچہ اس نے خوراک کی تلاش میں باہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

جس وقت وہ ''خوراک کی تلاش'' میں سڑک پر چل رہا تھا، تو اس نے جانا پہچانا شراب خانہ اور جانی پہچانی بھاپ اڑاتی روٹیاں دیکھیں مگر وہ ایک لمحہ بھی رکے بغیر چلتا رہا۔ وہ اِن چیزوں کی تلاش میں نہ تھا، گو کہ اُسے خود بھی خبر نہ تھی کہ وہ کس چیز کی تلاش میں تھا۔

وی چوآنگ کوئی بڑا شہر نہ تھا، چنانچہ وہ جلد ہی پیچھے رہ گیا۔ اس گاؤں سے باہر کا دیہی علاقہ چاول کے کھیتوں پر مشتمل تھا، ننھے چاول کی فصل حدِ نظر تک سبزہ پھیلا رہی تھی۔ کہیں کہیں جو گول، سیاہ اور حرکت کرنے والی چیزوں سے بنے نقطے نظر آتے وہ کھیتوں کو پانی دینے والے کسان تھے۔ مگر دیہی زندگی کی مسرتوں سے اندھا آہ کیو اپنی راہ چلتا گیا اس لیے کہ جبلی طور پر اُسے معلوم تھا کہ اسے کھانے کو کچھ نہ ملے گا۔ بالآخر وہ ''خود سُدھار کانونٹ'' کی دیواروں تک پہنچا۔

کانونٹ بھی چاول کے کھیتوں میں گھرا ہوا تھا، اس کی سفید دیواریں تازہ سبزے کے پس منظر میں نمایاں کھڑی تھیں اور مٹی کی چھوٹی دیوار کے اندر سبزی کا باغ تھا۔ آہ کیو لمحے کو جھجکا، آس پاس دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ وہ چھوٹی دیوار پھلانگ گیا۔ اندر سبزے کی افراط تھی، مگر زرد

شراب، بھاپ دیتی روٹی اور کھانے والی کسی چیز کا کوئی نشان نہ تھا۔مغربی دیوار کے پاس بانسوں کا ایک جُھنڈ تھا، بہت سی شاخوں کے ساتھ، مگر بدقسمتی سے یہ پکائی ہوئی نہ تھیں۔ وہاں گوار بھی تھا جو بہت عرصہ قبل بیج تک پک گیا تھا۔سرسوں پہلے ہی پھول دینے والی تھی اور چھوٹا گوبھیہت سخت لگتا تھا۔

آہ کیو ایک ایسے سکالر کی طرح رنجیدہ ہوا جو امتحان میں فیل ہو چکا ہو، اور وہ باغ کے گیٹ کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا جب وہ خوشی سے اچھلا۔اُس کے سامنے شلغم کا ایک قطعہ تھا۔ جونہی وہ جھکا اور شلغم اکھاڑنے لگا، پیچھے گیٹ سے اچانک ایک گول سر نمودار ہوا، جو کہ فوراً ہی پیچھے ہٹا۔اور وہ کوئی اور نہیں ننھی راہبہ تھی۔اب گو کہ آہ کیو ننھی راہبہ جیسے لوگوں کو بہت ہی حقیر سمجھتا تھا، مگر ایسے وقت آتے ہیں جب ''بہادری گلے پڑتی ہے''۔اس نے جلدی جلدی چار شلغم اکھاڑے، پتے توڑ پھینکے اور انہیں اپنی جیکٹ میں اڑس لیا۔اس وقت تک ایک بوڑھی راہبہ آ چکی تھی۔

''اے مہاتما بدھ ہماری حفاظت فرما۔ارے آہ کیو! تم نے شلغم چوری کرنے ہمارے باغ کو کیسے پھلاندا؟........... ارے، تم کس قدر پاپچیز ہو۔ اے مہاتما بدھ ہماری حفاظت فرما!............''۔

''میں کب شلغم چرانے تمہاری دیوار پھلاندا ہوں؟''۔آہ کیو نے روانہ ہوتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''وہ دیکھو!''بوڑھی راہبہ نے اس کی جیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ تمہارے ہیں؟۔کیا تم اِن شلغموں سے یہی کہلوا سکتی ہو؟............''۔

فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے آہ کیو جتنی تیز چل سکتا تھا، روانہ ہو گیا۔جس کے پیچھے ایک بہت ہی موٹا سیاہ کتا تھا۔کتا شروع میں اگلے گیٹ پر تھا، اور یہ ایک معمہ تھا کہ وہ پچھلے گیٹ تک کیسے پہنچا۔کالے کتے نے اس کا پیچھا کیا اور اس کی ٹانگ کو کاٹنے والا تھا کہ ایک شلغم اس کی جیکٹ سے ٹھیک وقت پہ گر پڑا۔اور کتا حیرت زدہ ہو کر ایک لمحہ کو رک گیا۔اس دوران آہ کیو شہتوت کے درخت کا سہارا لے کر کچی دیوار پھلانگ گیا اور کانونٹ کے باہر اپنے شلغموں کے ساتھ گر گیا۔کالا کتا

شہتوت کے درخت کے ساتھ ابھی تک بھونک رہا تھا اور بوڑھی راہبہ دعا پڑھ رہی تھی۔

اس خوف سے کہ کہیں بوڑھی راہبہ کتے کو باہر نکلنے کا نہ کہے آہ کیو نے اپنے شلغم اکٹھا کیے اور دوڑا۔اس نے کچھ پتھر بھی اٹھا لیے۔مگر کالا کتا دوبارہ نظر نہ آیا۔آہ کیو نے پتھر پھینک دیے اور چلتا رہا، ساتھ ساتھ کھاتا رہا۔وہ خود سے سوچ رہا تھا:''یہاں کچھ نہ ملے گا۔بہتر ہوگا کہ میں شہر چلا جاؤں...........''۔

جس وقت اس نے تیسرا شلغم ختم کر لیا اُس وقت تک اس نے شہر جانے کے لیے اپنا ذہن بنا لیا۔

باب چھ

بحالی سے زوال تک

وی چوآنگ نے اُس سال چاند میلہ تک آہ کیو کو پھر نہیں دیکھا۔ہر شخص اس کی واپسی کا سن کر حیران ہوا۔ہر ایک حیران تھا کہ وہ گیا کہاں تھا۔ پہلے جب آہ کیو شہر چلا جاتا تو وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ لوگوں کو مطلع کرتا تھا، مگر چونکہ اس بار اس نے ایسا نہیں کیا تھا اس لیے کسی نے اس کے جانے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔اس نے سرپرست دیوتا کے مندر کے بوڑھے انچارج کو بتایا ہوگا، مگر وی چوآنگ کے رواج کے مطابق صرف مسٹر چاؤ یا کامیاب کاؤنٹی امیدوار کے شہر جانے کو لوگ اہم سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ خارجی شیطان کے جانے پر بھی بات نہ ہوتی، آہ کیو کی تو بات ہی نہ تھی۔یہ تھی تشریح کہ کیوں بوڑھے آدمی نے اس کی خبر نہیں پھیلائی تھی۔نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں والوں کے پاس یہ جاننے کے ذرائع ہی نہ تھے۔

مگر آہ کیو کی اس بار کی واپسی پچھلی واپسیوں سے مختلف تھی، دراصل اس قدر مختلف کہ حیرت ہوتی ہے۔دن تاریکی میں ڈھل رہا تھا جب نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ وہ شراب کی دکان کے دروازے پر نمودار ہوا۔وہ کاؤنٹر تک گیا، اپنی جیب سے چاندی اور کاپر کے سکوں کی مٹھی بھر نکالی اور

کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ ’’نقد‘‘ وہ بولا۔ ’’شراب لاؤ!‘‘ وہ ایک نئی لکیر دار جیکٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی کمر کے ساتھ ایک بڑا پرس لٹک رہا تھا جس کے بھاری وزن نے اس کے بیلٹ کو نیچے کی طرف جھکا دیا تھا۔ وی چوآ نگ میں رواج تھا کہ جب بھی کسی کے بارے میں کوئی بات غیر معمولی لگتی، تو اس سے بے ادبی کے بجائے عزت سے پیش آیا جاتا۔ اب بھی گو کہ انہیں معلوم تھا کہ وہ آ ہ کیو ہے۔ مگر وہ پھٹے پرانے کوٹ والے آ ہ کیو سے تو بہت مختلف تھا۔ قدیم لوگ کہتے تھے ’’ایک سکالر جو تین دن تک باہر گیا ہوا ہو، اسے نئی نگاہ سے دیکھنا چاہیے‘‘۔ اور اس لیے ویٹر، مالک، خریدار اور راہ گیر سب قدرتی طور پر ایک سسپنس بھری عزت کا اظہار کر رہے تھے۔ مالک نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

’’ہیلو، آ ہ کیو، تو آپ واپس آ گئے!‘‘۔

’’ہاں میں واپس آ گیا ہوں‘‘۔

’’تم نے پیسہ کمایا............ کہاں سے............؟۔

’’میں شہر گیا‘‘۔

اگلے دن تک یہ خبر پوری وی چوآ نگ میں پھیل گئی۔ اور ہر شخص شراب خانے میں، چائے خانے میں اور مندر کے چھجے کے نیچے آ ہ کیو کے پیسہ اور نئی لکیر دار جیکٹ کی کامیاب کہانی سننا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے آ ہ کیو سے ایک نئی تعظیم کے ساتھ سلوک کرنا شروع کر دیا۔

آ ہ کیو کے بقول وہ ایک کامیاب صوبائی امیدوار کے گھر نوکر رہا۔ کہانی کے اس حصے نے اُن سب کو حیران کر لیا۔ انہوں نے خوف کے ساتھ سنا۔ اس کامیاب صوبائی امیدوار کا نام ’’پائی‘‘ تھا۔ مگر چونکہ وہ پورے شہر میں واحد کامیاب امیدوار تھا اس لیے اس کے خاندانی نام استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب بھی کوئی کامیاب صوبائی امیدوار کے بارے میں بات کرتا، اُس کا مطلب وہی ہوتا۔ اور صرف وی چوآ نگ میں ایسا نہ تھا بلکہ تیس میل تک کے علاقے میں ایسا تھا۔ لگتا تھا ہر شخص اسے ’’مسٹر کامیاب صوبائی امیدوار‘‘ کے نام سے جانتا تھا۔ اس طرح کے آدمی کے گھر میں کام کرنا قدرتی طور پر عزت دلاتا تھا۔ مگر آ ہ کیو کے مزید بیان کے مطابق وہ وہاں مزید کام کرنا نہیں

چاہتا تھا اس لیے کہ یہ کامیاب امیدوار زیادہ ہی ’’کچھوے کا انڈہ‘‘ تھا۔ کہانی کے اس حصے نے سارے سننے والوں کو ٹھنڈی آہ نکالنے پر مجبور کیا، مگر مسرت کے احساس کے ساتھ۔ اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ آ ہ کیو اصل میں ایسے شخص کے گھر میں کام کرنے کے لیے فٹ نہیں ہے، پھر بھی کام نہ کرنا ایک ترس کی بات تھی۔

آ ہ کیو کے بقول، اس کی واپسی اس حقیقت کے سبب بھی تھی کہ وہ شہری لوگوں سے مطمئن نہ تھا اس لیے کہ وہ لوگ ایک لمبے بنچ کو سیدھا بنچ کہتے تھے، مچھلی کو فرائی کرنے کے لیے ٹکڑے ٹکڑے کیے ہوئے پیاز استعمال کرتے تھے اور .... ایک نقص جو اس نے حال ہی میں دریافت کیا تھا............ عورتیں جب چلتی ہیں تو وہ ایک مطمئن انداز میں جھومتی نہیں ہیں۔ بہر حال، شہر کی اچھی باتیں بھی تھیں۔ مثال کے طور پر وی چوآ نگ میں ہر شخص بتیس بانس کے کاؤنٹرز کے ساتھ کھیلتا ہے اور صرف خارجی شیطان ماہ جونگ نامی کھیل سکتا ہے، مگر شہر میں حتیٰ کہ گلی کے بچے بھی ماہ جونگ میں ماہر ہیں۔ آپ کو اِن نوجوان بدمعاشوں کے ہاتھوں محض خارجی شیطان رکھنا ہوتا تھا، اس لیے وہ سیدھا ’’جہنم کے بادشاہ کے سامنے ایک چھوٹا شیطان‘‘ بن جاتا ہے۔ کہانی کے اس حصے سے سب سننے والوں کو شرما گئے۔

’’کیا تم نے کوئی سزائے موت دیکھی؟‘‘۔ آ ہ کیو نے پوچھا ’’آ ہ، وہ زبردست منظر ہوتا ہے............ جب وہ انقلابیوں کو سزائے موت دیتے ہیں............ کتنا عمدہ منظر ہوتا ہے، بہت ہی زبردست منظر............‘‘ جونہی اس نے اپنا سر گھمایا، اس کی تھوک چاؤ شوچن کے چہرے پر جا گری جو کہ عین مقابل موجود تھا۔ کہانی کے اس حصے نے سارے سننے والوں پر کپکپی طاری کی۔ پھر چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے اس نے اچانک اپنا دایاں بازو بلند کیا، اور وسکرز وانگ کی گردن پر گرا دیا جو کہ اپنا سر آگے کی طرف جھکائے سننے میں مگن تھا۔

’’قتل کرو!‘‘ آ ہ کیو چلایا۔

وسکرز وانگ اچھل پڑا، اور آسمانی بجلی کی تیزی میں اپنا سر اندر کھینچ دیا۔ جبکہ سامعین ایک مسرور خوف کے ساتھ کانپے۔ اُس کے بعد وسکرز وانگ کئی دنوں تک ایک بدحواسی میں رہا، اور اس نے آ ہ کیو

کے نزدیک جانے کی جرات نہ کی، نہ ہی دوسروں نے۔

گوکہ ہم اِس وقت یہ نہیں کہہ سکتے کہ وی چوآ نگ کے باشندوں کی نظر میں آہ کیو کا مقام مسٹر چاؤ سے اعلیٰ تھا، مگر ہم غلطی کے کسی خطرے کے بغیر یہ تو دعویٰ تو کر سکتے ہیں کہ یہ برابر برابر تھا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ آہ کیو کی شہرت اچانک وی چوآ نگ کی عورتوں کے کمروں میں بھی پھیل گئی۔ گو کہ وی چوآ نگ میں کسی تصنع کے حامل خاندان صرف چِن اور چاؤ کے تھے، اور باقیوں کا 9/10 حصہ غریب تھے، لیکن پھر بھی عورتوں کے علاقے تو عورت علاقے ہوتے ہیں، اور اُن میں آہ کیو کی شہرت کا پھیل جانا ایک معجزہ سے کم نہیں تھا۔ جب عورتیں ملتیں تو ایک دوسرے کو کہتیں ''مسز تساؤ نے آہ کیو سے ایک نیلا ریشم کا سکرٹ خریدا۔ گوکہ یہ پرانا تھا مگر وہ محض نوے سینٹ میں ملا۔ اور پائی ین کی ماں (اس کی ابھی تک تصدیق ہونی تھی اس لیے کہ کچھ کہتے ہیں کہ یہ چاؤ شُو چن کی ماں تھی) نے ارغوانی غیر ملکی سفید سوتی کپڑے والی ایک بچوں کی ایک پوشاک خریدی، جو کہ تقریباً نئی تھی، محض تین سو میں خریدا''۔

یوں جن عورتوں کے پاس ریشمی سکرٹ نہ تھے یا جنہیں غیر ملکی سفید سوتی کپڑا چاہیے ہوتا وہ بے قراری سے آہ کیو کو دیکھنا چاہتیں تا کہ اُس سے خرید لیں۔ اس سے نظر چرانے کے بجائے اب جب وہ گزرتا تو وہ اس کے پیچھے چلتیں، اسے رکنے کا کہنے۔

''آہ کیو تمہارے پاس مزید ریشمی سکرٹ ہیں؟'' وہ پوچھتیں۔

''نہیں؟۔ ہمیں غیر ملکی چاہیے بھی نہیں۔ تمہارے پاس ہے؟''۔

یہ خبر بعد میں غریب گھرانوں سے امیروں تک پھیلی۔ اس لیے کہ مسز تساؤ اپنے ریشمی سکرٹ سے اس قدر خوش تھی کہ اسے دکھانے مسز چاؤ کے پاس لے گئی اور مسز چاؤ نے مسٹر چاؤ کو اس کی تعریف میں بتایا۔

مسٹر چاؤ نے اس رات کھانے پر اپنے بیٹے کے ساتھ اس معاملے پر بات کی، جو کہ کامیاب کاؤنٹی امیدوار تھا۔ اس نے تجویز دی کہ آہ کیو کے بارے میں کچھ نہ کچھ عجیب سی بات تھی۔ اور انہیں اپنے دروازوں کھڑکیوں کے بارے میں مزید احتیاط کرنا ہوگی۔ گوکہ انہیں پتہ نہ تھا کہ آیا آہ کیو کے

پاس کچھ بچا تھا یا نہیں، اور سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس ابھی تک کچھ ہو۔ مسز چاؤ ایک اچھی، سستی فر کی بنی زیر جامہ چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک فیملی صلاح مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ مسز تساؤ سے کہا جائے کہ وہ یک دم آہ کیو کو ڈھونڈ لائے اور اس کے لیے اصول اور رواج میں ایک تیسری استثنا کی گئی۔ اس رات ایک لیمپ جلانے کی خصوصی اجازت دی گئی۔

کافی مقدار میں تیل جلایا گیا مگر پھر بھی آہ کیو کے کوئی آثار نہ تھے۔ سارا چاؤ خاندان بے صبری میں جمائیاں لے رہا تھا۔ اُن میں سے کچھ آہ کیو کی بے ڈسپلن طرز زندگی پر غصہ ہو رہے تھے۔ کچھ ناراضگی میں مسز تساؤ پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ آہ کیو کو یہاں لانے میں زیادہ محنت نہیں کر رہی۔ مسز چاؤ کو ڈر تھا کہ آہ کیو آنے کی جرات نہیں کرے گا اس لیے کہ اُس بہار میں ایسے شرائط طے ہوئے تھے۔ لیکن مسٹر چاؤ کے خیال میں پریشان ہونے کی بات نہ تھی اس لیے کہ اس نے کہا: ''اِس بار میں نے اُسے بلایا ہے''۔ اور بالکل یہی ہوا۔ مسٹر چاؤ عقلمند ثابت ہوا اس لیے کہ آہ کیو بالآخر مسز تساؤ کے ساتھ پہنچ گیا۔

''یہ کہتا جا رہا ہے کہ اس کے پاس اب کچھ نہیں بچا'' مسز تساؤ نے اندر آ کر ہانپتے ہوئے کہا۔'' جب میں نے اس سے کہا کہ وہ خود آ کر آپ کو بتا دے مگر وہ باتیں ہی کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا..........''۔

''جناب!'' آہ کیو نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم وہاں جا کر امیر ہو گئے ہو، آہ کیو''۔ مسٹر چاؤ نے اس کے پاس جا کر کہا'' بہت اچھا۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ پرانی چیزیں ہیں.......... اُن سب کو یہاں لاؤ تا کہ ہم انہیں دیکھیں..........''۔

''میں نے مسز تساؤ کو بتا دیا.......... کہ میرے پاس اب کچھ نہیں بچا''۔

''کچھ نہیں بچا؟'' مسٹر چاؤ اپنے غصے کو چھپا نہ سکا ''اتنی جلدی وہ چیزیں کہاں گئیں؟''۔

''وہ ایک دوست کی تھیں۔ شروع ہی زیادہ نہ تھیں۔ لوگوں نے خرید لیں..........''۔

''کچھ تو بچا ہوگا؟''۔

''بس دروازے کا ایک پردہ بچا ہے''۔

''تو وہی لے آؤ، ہمیں دکھاؤ'' مسٹر چاؤ نے تیزی سے کہا۔

''چلو کل لے آؤ''۔ مسٹر چاؤ نے کسی گرمجوشی کے بغیر کہا ''آئندہ جب بھی تمہارے پاس کوئی چیز ہو وہ تو تم پہلے ہماری طرف لاؤ.........''۔

.........ہم باقی لوگوں سے کم دام نہ دیں گے'' کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے کہا۔ اس کی بیوی نے آہ کیو کا ردعمل دیکھنے کے لیے تیزی سے اس پر نظر دوڑائی۔

''مجھے فر سے بنی ہوئی صدری چاہیے''۔ مسز چاؤ نے کہا۔

گوکہ آہ کیو رضامند ہوا مگر وہ اس قدر بے پرواہی سے جھکا کہ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے ان کی ہدایات سنجیدہ لیں یا نہیں۔ اس سے مسٹر چاؤ ناراض ہوا، اس قدر کہ اس نے جمائی لینی روک دی۔ کامیاب امیدوار بھی آہ کیو کے روپے سے مطمئن نہ تھا۔ اس نے کہا ''لوگوں کو اس طرح کے کچھوے کے انڈے سے محتاط رہنا چاہیے۔ اچھا یہ ہوگا کہ سرکاری افسر کو حکم دیا جائے کہ اسے وی چو آنگ میں رہنے کی اجازت نہ دے''۔

مگر مسٹر چاؤ اس کی بات سے متفق نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ اُس کے خلاف بغض رکھنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر یہ پرانی کہاوت ٹھیک ہے کہ ''عقاب خود اپنے گھونسلے پر شکار نہیں کرتا''۔ بس گاؤں والوں کو رات کو ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کامیاب امیدوار اس پدرانہ مشورے سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے آہ کیو کو گاؤں بدر کرنے کی تجویز واپس لی۔

البتہ اگلے دن جب مسز تساؤ نے اپنی نیلی سکرٹ کو سیاہ رنگ دینے اٹھالی تو اس نے آہ کیو سے متعلق یہ ہدایات دہرائیں۔ مگر اس نے کامیاب امیدوار کی پہلی تجویز نہیں دوہرائی۔ مگر یہی بات آہ کیو کی تباہی کے لیے کافی تھی۔ سب سے پہلے تو سرکاری افسر اس کے دروازے پر آیا اور دروازے کا پردہ لے گیا۔ گوکہ آہ کیو نے احتجاج کیا کہ مسز چاؤ اُس کو صرف دیکھنا چاہتی تھی مگر سرکاری افسر نے اسے واپس نہ کیا، بلکہ اس نے تو ماہانہ بھتے کا مطالبہ بھی کر دیا۔ دوسری طرف گاؤں والوں کا رویہ بدل گیا۔ انہوں نے آہ کیو سے میل جول کم کر دی۔ اس سے ایک قسم کا فاصلہ رکھنا شروع کر دیا۔

مگر کچھ آوارہ بے روزگار لوگ معاملے کی تہہ تک جانا چاہتے تھے۔ وہ احتیاط سے آہ کیو سے سوال کرنے لگے۔ اور آہ کیو نے چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی اور انہیں فخر سے بتایا۔ انہیں معلوم ہوا کہ وہ تو معمولی چور تھا۔ وہ نہ صرف دیواروں پر چڑھنے کے قابل نہ تھا بلکہ وہ سوراخوں میں سے بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ وہ سوراخ کے باہر کھڑا ہوکر چوری کردہ مال وصول کرتا تھا۔

ایک رات اس نے ایک گٹھڑی وصول کی اور اس کا ساتھی دوسری گٹھڑی لینے دوبارہ اندر چلا گیا جب اُس نے اندر شور سنا۔ وہ سرپٹ وہاں سے بھاگا۔ وہ اسی رات قصبہ سے بھاگا اور دوبارہ وی چو آنگ آگیا۔ اُس کے بعد اُس نے یہ دھندا ہی چھوڑ دیا۔ یہ قصہ آہ کیو کے لیے مزید نقصان دہ ثابت ہوا۔ لوگ اس سے مزید دور کھچ گئے۔

باب سات

انقلاب

بادشاہ سوآن تنگ کی حکمران کے تیسرے برس کے نویں مہینے کے 14 ویں دن (جب شاؤ سنگ کو 1911 کے انقلاب میں رہا کر دیا گیا)، اس روز آہ کیو نے اپنا پرس چاؤ پائی ین کو فروخت کر دی۔ آدھی رات کو تیسری گھڑی کے چوتھے ضرب کے بعد، ایک بڑے سیاہ سایہ بان کے ساتھ ایک بڑی کشتی چاؤ خاندان کے پاس رک گئی۔ یہ کشتی اندھیرے میں اُس وقت آئی جب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ اس لیے انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا۔ مگر یہ کشتی صبح کو روانہ ہوگئی تو بہت سارے لوگوں نے اسے دیکھا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ کشتی دراصل کامیاب صوبائی امیدوار کی تھی۔

اس کشتی نے وی چو آنگ میں بہت بے چینی پھیلا دی۔ اور دوپہر سے قبل سارے گاؤں والوں کے دل تیز دھڑکنے لگے۔ چاؤ خاندان کشتی کی خبر کے متعلق بالکل خاموش رہا۔ مگر چائے خانے اور شراب خانے میں کھسر پھسر کے مطابق انقلابی، گاؤں میں داخل ہونے والے تھے

اور کامیاب صوبائی امیدوار پناہ لینے گاؤں آیا تھا۔صرف مسز تساؤ مختلف سوچ رہی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ کامیاب صوبائی امیدوار محض کچھ مسمار شدہ صندوق گاؤں رکھنے لایا تھا،لیکن مسٹر چاؤ نے انہیں واپس بھیجا۔اصل میں چاؤ خاندان میں کامیاب صوبائی امیدوار، اور کامیاب کاؤنٹی امیدوار کے باہمی تعلقات اچھے نہ تھے۔اس لیے یہ بات منطق نہیں ہوسکتی کہ وہ دشمنی میں دوستی ثابت کریں۔ مزید برآں چونکہ مسز تساؤ، چاؤ خاندان کی پڑوسن تھی اس لیے اسے زیادہ اندازہ ہوسکتا تھا کہ وہاں کیا ہورہا ہے، اگر ایسا ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا۔

پھر ایک افواہ یہ پھیلی کہ حالانکہ سکالر خود نہیں پہنچا، اس نے ایک طویل خط بھیجا جس میں چاؤ خاندان کے ساتھ دور کی رشتے داری ظاہر کرلی۔اور مسٹر چاؤ نے غور وفکر کے بعد سوچا کہ صندوقوں کو اپنے پاس رکھنے میں کوئی نقصان نہیں ہے، اس لیے اب وہ اس کی بیوی کی چارپائی کے نیچے رکھے ہیں۔ جہاں تک انقلابیوں کا تعلق ہے، کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ اُس رات کو سفید ہیلمٹ اور سفید زرہ بکتر کے ساتھ قصبہ میں داخل ہوچکے تھے۔

آہ کیو نے انقلابیوں کے بارے میں بہت عرصہ سے سن رکھا تھا، اور اس سال اپنی آنکھوں سے انقلابیوں کے سر قلم کرتے ہوتے دیکھے تھے۔مگر چونکہ اسے لگا کہ انقلابی باغی ہیں اور یہ کہ ایک بغاوت اس کے لیے مشکلات پیدا کرے گی، اس لیے وہ ہمیشہ ان سے نفرت کرتا رہا، اُن سے دور رہا۔کون تصور کرسکتا تھا کہ وہ تیس میل کے علاقے میں مشہور کامیاب صوبائی امیدوار کو خوفزدہ کرسکیں گے؟۔نتیجہ میں آہ کیو اس ''رسائی'' پر سارے گاؤں والوں کے دہشت کو اپنی مسرت میں جمع کرنے کے احساس میں تھا۔

''انقلاب بری چیز نہیں ہوتی'' آہ کیو نے سوچا ''اُن سب کو ختم کردو............جہنم میں ڈال دو اُن سب کو!............میں خود بھی انقلابیوں میں جا کر شامل ہوجاؤں گا''۔

آہ کیو حال ہی میں سخت ہوچکا تھا، اور شاید غیر مطمئن تھا۔اس پر مزید یہ حقیقت کہ اس نے دوپہر کو خالی پیٹ شراب کے دو کٹورے چڑھا دیے تھے۔نتیجہ یہ کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ جلدی دھت ہوگیا۔اور جب وہ سوچتا ہوا چل رہا تھا تو اس نے محسوس کیا جیسے کہ وہ ہوا پر چل رہا ہو۔

اچانک، ایک عجب طریقے سے، اس نے محسوس کیا جیسے وہ خود انقلابی ہو، اور وی چوآنگ کے سارے لوگ اُس کے قید میں ہیں۔خوشی برداشت نہ کرتے ہوئے وہ زور زور سے چلّانے لگا:

''بغاوت! بغاوت!''۔

سارے گاؤں والے اُس کی طرف خوف سے دیکھنے لگے۔آہ کیو نے اس سے قبل اس طرح کی قابلِ ترس نگاہیں نہیں دیکھی تھیں۔اسے وہ لوگ ایسے فرحت بخش لگ رہے تھے جیسے وسط گرمیوں میں ٹھنڈا پانی پیا جائے۔چنانچہ وہ مزید سرخوشی میں چلتا رہا، چلّاتا رہا:

''ٹھیک ہے............میں جو چاہوں اٹھالوں گا!
جسے چاہوں پسند کروں گا!

لالا، لالا

میں اپنے قسم خوردہ بھائی، چینگ کو،
اپنے کوزے میں غلطی سے قتل کرنے پر پشیمان ہوں۔
میں پشیمان ہوں قتل کرنے پر، آہاہاہا!

لالا لالا لالا

میں تمہیں فولادی عصا سے کچل ڈالوں گا''

مسٹر چاؤ، اپنے بیٹے اور دور رشتہ داروں کے ساتھ اپنے گیٹ پر کھڑے انقلاب پر باتیں کررہے تھے۔مگر آہ کیو نے انہیں نہیں دیکھا اور وہ گاتے ہوئے پاس سے گزرا۔''لالالالالا''

''کیو۔ارے پرانے دوست!'' مسٹر چاؤ نے دھیمی آواز سے بزدلی میں پکارا۔

''لالالالا'' آہ کیو گاتا رہا۔وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اُس کے نام کے ساتھ ''پرانے دوست'' کے لفظ شامل کیے جاسکتے ہیں۔اسے یقین تھا کہ اس نے غلط سنا، اور کسی طرح سے اس کا کوئی معاملہ نہ تھا، وہ گاتا چلا گیا۔

''لالا لالا للا!''

''کیو پرانے دوست''

''میں قتل کرنے پر پشیمان..........''۔

''آہ کیو!'' کامیاب امیدوار نے اسے نام سے پکارا۔

تبھی آہ کیو رک گیا۔''ہاں؟''اس نے سر ایک طرف جھکاتے ہوئے پوچھا

''کیو، پرانے دوست ....اب ....'' مگر مسٹر چاؤ کو پھر الفاظ نہیں مل رہے تھے۔''کیا تم اب امیر ہو رہے ہو؟''۔

''امیر؟۔ یقیناً میں جو چاہوں لے سکتا ہوں..........''

''آہ کیو، پرانے دوست، تمہارے ہم جیسے غریب دوست شاید اہمیت نہ رکھیں.......... چاؤ پائی ین نے پریشانی سے کہا، جیسے کہ انقلابیوں کے رویے کی شکایت کر رہا ہو۔

''غریب دوست؟۔ یقیناً تم مجھ سے امیر ہو''۔ آہ کیو نے کہا اور چلا گیا۔

وہ وہاں گم سم اور مایوس کھڑے رہے۔ پھر مسٹر چاؤ اور اس کا بیٹا گھر کے اندر چلے گئے، اور اس شام اس مسئلے پر بحث کرتے رہے جب تک کہ لیمپ جلانے کا وقت ہو گیا۔ جب چاؤ پائی ین گھر گیا تو اس نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور اسے اپنی بیوی کو ایک لوہے کی صندوق کی تہہ میں چھپانے کو دیا۔

کچھ وقت کے لیے آہ کیو کو لگا جیسے ہوا میں چل رہا ہو، مگر جب تک وہ سرپرست دیوتا کے مندر پہنچا، وہ پھر پرسکون ہو چکا تھا۔ اس شام مندر کا انچارج بوڑھا بھی غیر متوقع طور پر دوستانہ رہا اور اسے چائے پیش کی۔ پھر آہ کیو نے اس سے دو چپٹے کیکوں کی فرمائش کی، اور انہیں کھانے کے بعد اس نے چار اونس کی موم بتی کا مطالبہ کیا اور موم بتی دان کا بھی۔ اس نے موم بتی جلائی اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں تنہا لیٹ گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر تازہ اور پرمسرت محسوس کر رہا تھا، جبکہ موم بتی لالٹین میلہ کی طرح تیز اور لپکتی روشنی اچھال رہی تھی اور اس کا تصور بھی بلندی پر اڑتا لگتا تھا۔

''بغاوت؟۔ یہ ایک شغل میلہ ہو گا..........انقلابیوں کا ایک گروہ آئے گا۔ سب نے سفید ہیلمٹ اور سفید زرہ بکتر پہنے ہوں گے، سب نے تلواریں، فولادی لاٹھیاں، بم، غیر ملکی بندوقیں، تیز نوک والے دو دھاری چاقو اور نیزے اٹھائے ہوں گے۔ وہ سرپرست دیوتا کے مندر

آئیں گے۔ اور پکاریں گے۔''آہ کیو ہمارے ساتھ آؤ، ہمارے ساتھ آؤ!''۔ اور پھر میں اُن کے ساتھ چلا جاؤں گا..........

''پھر سارے گاؤں والے ایک قابلِ ہنسی والی حالت میں ہوں گے، جھک جائیں گے اور فریاد کریں گے،'آہ کیو، ہماری زندگیاں بچاؤ'۔ مگر انہیں کون سنے گا! سب سے پہلے مریں گے ینگ ڈی اور مسٹر چاؤ!۔ پھر کامیاب کاؤنٹی امیدوار اور غیر ملکی شیطان۔..........مگر شاید میں کچھ کو معاف کر دوں۔ میں شاید کبھی وسکرز وانگ کو بچا لیتا مگر اب تو بالکل نہیں چھوڑوں گا..........

''چیزیں..........میں سیدھا اندر جاؤں گا اور صندوقیں کھول دوں گا: چاندی کے ڈلے، غیر ملکی سکّے، غیر ملکی سفید سوتی جیکٹس .... پہلے میں کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی بیوی کا پلنگ مندر لے جاؤں گا، اور چی این خاندان کی میزیں اور کرسیاں بھی.......... یا پھر بس چاؤ خاندان کی چیزیں استعمال کروں گا۔ میں خود ایک تنکے کا کام بھی نہیں کروں گا بلکہ ینگ ڈی کو حکم دوں گا کہ وہ سارے کام کرے، اور اس وقت تک اس سے کام کرواتا رہوں گا جب تک کہ وہ منہ پر ایک تھپڑ نہ مانگے..........

''چاؤ سنر وچین کی چھوٹی بہن بہت بدصورت ہے۔ چند سالوں میں مسز تساؤ کی بیٹی کے متعلق غور کیا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی شیطان کی بیوی چوٹی کے بغیر کسی آدمی کے ساتھ سونے پر راضی ہے۔ ہاہ۔ وہ اچھی عورت نہیں ہو سکتی۔ کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی بیوی کی آنکھ کے پپوٹوں پر نشانات ہیں.......... میں نے کافی عرصہ سے آماہ وو کو نہیں دیکھا، اور نہیں جانتا وہ عورت کہاں ہے..........اُس کے پیر کتنے بڑے ہیں''۔

آہ کیو کے ایک مطمئن نتیجے تک پہنچنے سے پہلے خراٹوں کی آوازیں آئیں۔ چار اونس والی موم بتی محض آدھ انچ جل چکی تھی، اور اس کی بھڑکتی روشنی نے اس کے کھلے منہ کو اور کھول دیا۔

''ہو، ہو'' آہ کیو اچانک چلایا۔ اس نے سر اٹھایا اور وحشت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ دوبارہ لیٹ گیا اور سو گیا۔

اگلی صبح وہ بہت دیر میں جاگا اور جب وہ باہر گلی میں گیا تو ہر چیز حسبِ سابق تھی۔ وہ ابھی

تک بھوکا تھا، مگر حالانکہ اس نے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی چیز کے بارے سوچنے کے قابل نہ تھا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ آہستہ چلتا رہا جب تک کہ وہ جان بوجھ کر، یا اتفاقاً خود سدھار کانونٹ پہنچا۔

کانونٹ اپنی سفید چار دیواری اور کالے گیٹ کے ساتھ موسم بہار میں بہت پر امن تھا۔ ایک لمحے کے غور کے بعد اس نے گیٹ کھٹکھٹایا جس پر ایک کتا بھونکنے لگا۔ اس نے تیزی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے بہت سے ٹکڑے اٹھائے اور پھر گیٹ کو مزید زور سے کھٹکھٹانے گیا۔ وہ اس وقت تک کھٹکھٹاتا رہا جب تک کہ گیٹ پر چھوٹے چھوٹے ڈینٹ نمودار ہوئے۔ بالآخر اس نے کسی کو گیٹ کھولنے کے لیے آتے سنا۔

آہ کیو نے تیزی سے اینٹ کے ٹکڑے تیار رکھے اور ٹانگیں پھیلائے کھڑا رہا۔ وہ سیاہ کتے سے لڑنے کے لیے تیار تھا۔ مگر کانونٹ گیٹ محض ایک درز جتنا کھلا اور کوئی کالا کتا باہر نہیں لپکا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں بوڑھی راہبہ تھی۔

''تم پھر یہاں کیوں آئے؟''۔ اس نے کہا۔

''ایک انقلاب ہے.......... تمہیں معلوم ہے؟'' آہ کیو نے مبہم طور پر کہا۔

''انقلاب، انقلاب.......... پہلے ہی ایک ہو چکا ہے''۔ بوڑھی راہبہ نے کہا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں۔ ''تمہارا کیا خیال ہے تمہارے انقلابوں سے ہمیں کیا ہوگا''؟۔

''کیا؟''۔ آہ کیو نے تعجب سے پوچھا۔

''تم نہیں جانتے؟۔ انقلابی پہلے ہی یہاں آ چکے ہیں!''۔

''کون؟'' آہ کیو نے مزید حیرانگی سے پوچھا۔

''کامیاب کاؤنٹی امیدوار اور غیر ملکی شیطان''۔

یہ آہ کیو کے لیے مکمل حیرانگی کی بات تھی، وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ جب بوڑھی راہبہ نے دیکھا کہ وہ اب نرم پڑ گیا ہے، تو اس نے تیزی سے گیٹ بند کر دیا، اس طرح کہ اگر آہ کیو دوبارہ دھکا دے تو یہ نہ کھل سکے۔ اور جب اس نے دوبارہ کھٹکھٹایا تو وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔

یہ اُس صبح ہوا تھا۔ چاؤ خاندان میں کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے تیزی سے خبر سنی، اور جونہی اس نے سنا کہ انقلابی اُس رات قصبے میں داخل ہو چکے ہیں تو اس نے فوراً ہی اپنی چٹیا سر پہ لپیٹ دی اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ چی این خاندان سے غیر ملکی شیطان سے ملنے چلا گیا جس کے ساتھ وہ کبھی بھی اچھے تعلقات میں نہیں رہا تھا۔ یہ، اصلاحات کے لیے سب کو کام کرنے کا وقت تھا۔ اس لیے ان کے درمیان خوشگوار گفتگو ہوئی اور وہ وہیں ساتھی بنے اور آپس میں عہد کیا کہ وہ انقلابی بنیں گے۔

کچھ دیر دماغ خرچ کرنے کے بعد انہیں یاد آیا کہ خود سدھار کانونٹ کے اوپر ''بادشاہ زندہ باد'' لکھا ہوا ہے جسے فوراً مٹا دینا ہے۔ چنانچہ وہ لمحہ ضائع کیے بغیر انقلابی سرگرمی کرنے کانونٹ پہنچے۔ چونکہ بوڑھی راہبہ نے انہیں ایسا کرنے سے روکا اور کچھ سنائیں، تو انہوں نے خیال کیا کہ وہ راہبہ خود ہی مانچو حکومت ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے سر پر مکے برسائے اور لاٹھیاں ماریں۔ جب وہ چلے گئے تو بوڑھی راہبہ نے خود کو سنبھالا اور آس پاس دیکھا۔ ظاہر ہے بادشاہ والا بورڈ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر پڑا تھا۔ رحم کی دیوی کے سامنے لگا ہوا خوبصورت بورڈ بھی غائب تھا۔

آہ کیو کو یہ سب کچھ بعد میں معلوم ہوا۔ اسے اُس وقت گہری نیند سونے پہ سخت پشیمانی ہوئی اور وہ اس بات پہ افسوس کر رہا تھا کہ وہ اُسے بلانے نہ آئے۔ مگر پھر اس نے خود سے کہا'' ہوسکتا ہے انہیں پتہ نہ ہو کہ میں انقلابیوں میں شامل ہو چکا ہوں''۔

آٹھواں باب

انقلاب سے خارج شدہ

وی چوآنگ کے لوگ ہر روز مزید مطمئن ہوتے گئے۔ آنے والی خبروں سے وہ یہ جانتے تھے کہ، گو کہ انقلابی قصبہ میں داخل ہوگئے تھے، مگر اُن کی آمد نے کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی۔ مجسٹریٹ ابھی تک اعلیٰ افسر تھا، بس اُس کے عہدے کا نام تبدیل ہو گیا تھا، اور کامیاب صوبائی

امیدوار بھی کسی عہدے پر تھا...........وی چوآنگ کے لوگوں کو اِن عہدوں کے نام معلوم نہ تھے۔ فوج کا سربراہ بھیو ہی پرانا کیپٹن تھا۔خطرے کی واحد گھنٹی یہ تھی کہ وہاں کچھ برے انقلابی بھی تھے جو گڑ بڑ کر رہے تھے۔انہوں نے اپنے پہنچنے کے اگلے دن لوگوں کی چٹیائیں کاٹنی شروع کر دیں۔کہا جا رہا تھا کہ اگلے گاؤں کا کشتی بان ''سات پاؤنڈی'' اُن کے حلقے میں پھنس گیا، اور اب اُس کی صورت بگاڑ دی گئی تھی۔ پھر بھی یہ خطرہ اتنا بڑا نہ تھا اس لیے کہ وی چوآنگ کے دیہاتی اول تو شہر کبھی کبھار جاتے تھے اور جن لوگوں نے شہر جانے کا ارادہ کیا ہوا تھا انہوں نے بھی یکدم ارادہ ملتوی کیا تا کہ خدشہ ہی نہ رہے۔آہ کیو اپنے دوستوں سے ملنے شہر جانا چاہتا تھا مگر جونہی اُس نے یہ خبر سنی مایوسی سے ارادہ بدل دیا۔

البتہ یہ کہنا غلط ہوگا کہ وی چوآنگ میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی۔ اگلے چند دنوں کے دوران ایسے لوگوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی گئی جنہوں نے اپنی چٹیائیں اپنے سر کے اوپر لپیٹ دیں۔ اور جیسا کہ پہلے کہا گیا اس طرح کرنے والوں میں سے پہلا شخص، کامیاب کاؤنٹی امیدوار تھا، دوسرا چاؤسنر وچین، اور چاؤ پائی ین تھے اور اُن کے بعد آہ کیو تھا۔ اگر یہ موسم گرما ہوتا تو یہ عجیب نہ لگتا اگر ہر شخص اپنی چٹیا سر پر لپیٹ دیتا یا اُس میں گرہیں لگاتا۔ مگر یہ تو خزاں کا آخر تھا۔ اس طرح سردیوں میں گرمیوں کی طرح چٹیا سر پر لپیٹنا ایک ہیرو جیسا فیصلہ لگتا تھا، اور جہاں تک وی چوآنگ کا معاملہ تھا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں اصلاحات نہیں ہو رہے تھے۔

جس وقت چاؤسنر وچین اپنی گردن کا منکا ننگا کیا ہوا آیا تو جن لوگوں نے اسے دیکھا، کہا ''آہ، دیکھو ایک انقلابی آ رہا ہے!''۔

جب آہ کیو نے یہ سنا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ گو کہ اس نے بہت عرصہ قبل سن رکھا تھا کہ کس طرح کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے اپنی چٹیا اپنے سر پر لپیٹ دی تھی مگر اُسے کبھی ایسا کرنے کا خیال نہیں آیا۔ اب جب کہ چاؤسنر وچی این نے یہ کام کیا تو اس کو بھی ایسا کرنے کا خیال آیا۔ اس نے اُن لوگوں کی نقل کرنے کے لیے اپنا ذہن بنا لیا۔ اس نے اپنی چٹیا کو اپنے سر پر لپیٹنے کے لیے بانس کی ایک تیلی لی، اور کچھ دیر تک جھجکنے کے بعد بالآخر باہر نکلنے کی جرات کر لی۔

جب وہ گلی میں چل رہا تھا تو لوگ اسے دیکھتے۔ مگر کسی نے کچھ نہ کہا۔ آہ کیو پہلے تو خفا ہوا، اور پھر بہت رنجیدہ ہوا۔ ابھی حال میں وہ جلد طیش میں آنے لگا تھا۔ درحقیقت اس کی زندگی انقلاب سے قبل کی زندگی سے زیادہ مشکل نہ تھی۔ لوگ اس سے اچھی طرح پیش آتے، اور دکان دار اب نقد ادائیگی پر اصرار نہیں کرتے تھے، مگر آہ کیو پھر بھی غیر مطمئن تھا۔ اس نے سوچا کہ اب جبکہ ایک انقلاب آ چکا ہے، اسے اس میں مزید شامل کرنا، چاہیے۔ اور پھر اس نے ینگ ڈی کو دیکھا، تو اُس کا طیش بے قابو ہو گیا۔

ینگ ڈی نے بھی اپنی چٹیا سر پر لپیٹ دی تھی۔ اور مزید برآں اس نے بھی ایسا کرنے کے لیے بانس کی ایک تیلی استعمال کی تھی۔ آہ کیو نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ینگ ڈی ایسا کرنے کی جرات بھی کرے گا۔ وہ یقیناً ایسی چیز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ینگ ڈی بھلا ہے کون؟۔ اسے سوجھا کہ وہ اُسے وہیں دبوچ لے، اس کا بانس کی تیلی توڑ ڈالے، اس کی چٹیا کو نیچے لٹک جانے دے اور اسے اپنی اوقات بھول جانے اور ایک انقلابی بننے کا دکھاوا کرنے پر سزا کے بطور اس کے چہرے پہ کئی تھپڑ مارے۔ مگر آخر میں اس نے اسے جانے دیا، بس غصہ سے اسے گھورا، تھوکا اور ''پاہ'' کی آواز نکالی۔

ان آخری چند دنوں میں شہر جانے والا واحد آدمی غیر ملکی شیطان تھا۔ چاؤ خاندان کے کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے کامیاب صوبائی امیدوار سے ملنے کے لیے جانے کا سوچا تھا۔ مگر اس خدشے نے اسے جانے کے اپنے پروگرام کو ملتوی کرایا کہ کہیں اس کی چٹیا نہ کاٹی جائے۔ اس نے ایک انتہائی روایتی خط لکھا، اور غیر ملکی شیطان سے اُسے شہر لے جانے کو کہا۔ اس نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ اسے لبرٹی پارٹی سے متعارف کرائے۔ جب غیر ملکی شیطان واپس آیا تو اس نے کامیاب کاؤنٹی امیدوار سے چار ڈالر مانگے، جس کے بعد کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے سینے پر چاندی کا ایک بیج لگا لیا۔ وی چوانگ گاؤں کے سارے لوگ دہشت زدہ ہوئے، اور کہا کہ یہ کھجور آئل پارٹی کا بیج ہے (دیہاتیوں کو لبرٹی پارٹی کا نام نہ آتا تھا چنانچہ انہوں نے اُس کا یہ ترجمہ کر ڈالا)۔ اور یہ بیج چنگ بادشاہی کا سب سے بڑی لٹریری ڈگری ہوا کرتی تھی۔ نتیجے میں چاؤ کا وقار اچانک بڑھا۔

بہت ہی زیادہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ باقی سب کو حقیر نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور جب اس نے آہ کیو کو دیکھا تو اسے اور نظر انداز کر دیا۔

آہ کیو ہمیشہ خود کو نظر انداز دیکھتے ہوئے بہت بے چین تھا، مگر جس وقت اس نے اس سلور بیج کے بارے میں سنا اس نے فوراً احساس کیا کہ جیسے اسے سردی میں باہر چھوڑ دیا گیا ہو۔ سادہ بات تھی کہ کسی کو ایک انقلابی بننے کے لیے، اپنی چٹیا سر پر لپیٹنا کافی نہ تھا۔ سب سے اہم چیز انقلابی پارٹی سے تعلق استوار کرنا تھا۔ مگر وہ تو اپنی پوری زندگی صرف دو انقلابیوں کو جانتا تھا، ایک جس کے کے لیے وہ پہلے ہی شہر میں اپنا سر گم کر چکا تھا، اب صرف غیر ملکی شیطان رہ گیا تھا۔ جب تک وہ فوری طور پر غیر ملکی شیطان کے پاس جا کر گفتگو نہ کرتا اُس کے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا۔

چی این ہاؤس کا سامنے والا گیٹ کھلا ہوا تھا، اور آہ کیو بزدلی سے دبک کر اندر رینگ گیا۔ وہ سیدھا آگے کو چل پڑا اس لیے کہ اس نے غیر ملکی شیطان کو سیاہ لباس میں احاطے کے مرکز میں دیکھا۔ بلا شبہ یہ غیر ملکی لباس تھا۔ اس نے ایک سلور بیج بھی لگا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس سے آہ کیو پہلے واقف تھا۔ اس کے سر پر ایک فٹ جتنے لمبے بال تھے جو اس نے شانوں پہ ڈال رکھے تھے۔ اس کے بال اس طرح بکھرے ہوئے لٹک رہے تھے کہ وہ لٹکتے بالوں سے مشہور چینی فوک کا لافانی لیو لگ رہا تھا۔ اس کے سامنے چاؤ پائی ین اور تین دوسرے سیدھے کھڑے تھے۔ وہ سب اس کی باتوں کو مکمل تعظیم کے ساتھ سن رہے تھے۔

آہ کیو ایڑیوں کے بل چاؤ پائی ین کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلام دعا کرے مگر نہیں جانتا تھا کہ کیا کہے۔ ظاہر ہے وہ اس شخص کو غیر ملکی شیطان تو نہیں کہہ سکتا تھا، نہ ہی ''غیر ملکی'' اور نہ ہی ''انقلابی'' مناسب لگتے تھے۔ شاید سب سے مناسب بات تھی ''مسٹر غیر ملکی''۔

مگر مسٹر غیر ملکی نے اسے نہیں دیکھا تھا اس لیے کہ آنکھیں اٹھی ہوئی وہ بہت غور و فکر سے بول رہا تھا۔

''جب ہم ملے تو میں کہتا رہا ''پرانے دوست'' ہمیں اس کے ساتھ نمٹنا چاہیے!''۔ مگر وہ ہمیشہ جواب دیتا ''نہیں!'' .... ۔ وگرنہ ہم بہت پہلے کامیاب ہو چکے ہوتے۔ اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ کتنا محتاط ہے۔ اس نے مجھ سے بار بار ہُو پیہ جانے کو کہا مگر میں راضی نہ ہوا۔ کون ایک چھوٹے سے دیہی قصبے میں کام کرنا چاہے گا؟......

''ار............ار'' آہ کیو کے منہ سے یہی لفظ نکل سکے۔ وہ چاہتا تھا کہ مسٹر غیر ملکی وقفہ لے لے۔ اور وہ بولنے کے لیے جرات جمع کرنے لگا۔ مگر کسی وجہ سے وہ اب تک اسے مسٹر غیر ملکی نہ کہہ سکا۔

سننے والے چاروں آدمی آہ کیو کی طرف دیکھنے کے لیے مڑے۔ مسٹر غیر ملکی کی نظر بھی پہلی بار اس پر پڑی۔

''کیا ہے؟''۔

''میں............''۔

''دفع ہو جاؤ!''

''میں شامل ہونا چاہتا ہوں............''

''نکل جاؤ!'' مسٹر غیر ملکی نے چھڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

پھر چاؤ پائی ین اور دوسرے چلاّئے ''مسٹر چی ین تمہیں باہر نکل جانے کا کہہ رہے ہیں، تمہیں سنائی نہیں دیتا؟''۔

آہ کیو نے اپنا سر بچانے کے لیے سر پر ہاتھ رکھا، اور یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے، گیٹ کی طرف بھاگنے لگا۔ مگر اس بار مسٹر غیر ملکی نے اس کا پیچھا نہ کیا۔ ساٹھ قدم دوڑ چکنے کے بعد آہ کیو اپنی رفتار کم کرنے لگا۔ اب وہ بہت پریشان تھا اس لیے کہ اگر مسٹر غیر ملکی اسے ایک انقلابی ہونے کی اجازت نہیں دے گا تو اُس کے لیے دوسرا کوئی راستہ کھلا نہ ہوگا۔ مستقبل میں تو وہ کبھی امید نہیں رکھ سکے گا کہ سفید ہیلمٹوں اور سفید زرہ بکتروں میں ملبوس لوگ آ کر اُسے بلائیں گے۔ اس کی ساری ہوس، امیدیں، مقاصد، اور مستقبل ایک ہی جھٹکے میں تباہ کیے گئے۔ حقیقت میں یہ بات کم اہمیت کی تھی کہ لوگ یہ خبر پھیلائیں گے اور وہ ینگ ڈی جیسے لوگوں کی ہنسی کا مرکز بن جائے گا۔

اس سے قبل اس نے کبھی بھی خود کو اتنا خالی ہاتھ محسوس نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی چٹیا کا سر پر

لپیٹنا بھی اب اسے بے مقصد اور مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ انتقام کے بطور وہ چڑیا پھر سے نیچے لٹکانا چاہ رہا تھا مگر اس نے ایسا کیا نہیں۔ وہ شام تک یونہی گھومتا رہا جب قرض پر شراب کے دو کٹورے پینے کے بعد وہ بہتر محسوس کرنے لگا، اور پھر سے اپنے دماغ کی آنکھ سے سفید ہیلمٹوں اور سفید زرہ بکتروں کے مناظر دیکھنے لگا۔

اس دن وہ آدھی رات تک آوارگی کرتا رہا۔ جب شراب خانہ بند ہونے لگا تب جا کر وہ بھی واپس سرپرست دیوتا کے مندر لوٹنے کے لیے ڈگمگانے لگا۔

''بینک، بمپ!''۔

اس نے اچانک ایک غیر معمولی آواز سنی۔ آہ کیو ہمیشہ تجسس پسند کرتا تھا اور دوسروں کے کاموں میں ٹانگ اڑانے میں لطف لیتا تھا۔ چنانچہ وہ اندھیرے میں شور کی تلاش میں نکلا۔ اس نے آگے قدموں کی آواز سنی۔ وہ احتیاط سے سن رہا تھا۔

پھر اس نے اچانک اپنے سامنے ایک شخص کو بھاگتے دیکھا۔ جونہی آہ کیو نے اسے دیکھا، وہ مڑا اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ ممکنہ حد تک تیز دوڑتے ہوئے ایسا کر رہا تھا۔ جب اس شخص نے موڑ کاٹی، آہ کیو بھی مڑا۔ اور جب ایک موڑ مڑ کر وہ شخص رک گیا تو آہ کیو بھی رک گیا۔ اس نے دیکھا کہ پیچھے کوئی نہیں ہے، اور یہ کہ وہ شخص ینگ ڈی تھا۔

''کیا بات ہے؟''۔ آہ کیو نے پوچھا۔

''چاؤ............ چاؤ خاندان کے ہاں ڈاکہ پڑا'' ینگ ڈی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

آہ کیو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے یہ بتانے کے بعد ینگ ڈی چلا گیا۔ آہ کیو دوڑ پڑا اور پھر دو یا تین بار رک گیا۔ البتہ چونکہ ایک زمانے میں وہ خود یہی کام کرتا رہا، وہ استثنائی طور پر خود کو بہادر محسوس کرنے لگا۔ گلی کے کونے سے نکلتے ہوئے، اس نے احتیاط سے سنا اور سوچا کہ وہ سفید ہیلمٹوں اور زرہ بکتروں میں ملبوس کئی لوگ دیکھ سکے گا جو کہ ٹرنک اٹھائے ہونگے، فرنیچر اٹھائے ہوں گے، حتیٰ کہ کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی بیوی کا پلنگ بھی اٹھائے ہوں گے۔ مگر وہ انہیں واضح طور پر نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ مزید قریب جانا چاہ رہا تھا مگر اس کے پیر جیسے فرش پہ گڑ چکے تھے۔

اس رات چاندنی نہ تھی، اور وی چوآنگ گھپ اندھیرے میں بہت خاموش تھا۔ آہ کیو وہاں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ اس کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ ہر چیز ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔ دُور لوگ آ جا رہے تھے۔ چیزیں اٹھائے ہوئے، ٹرنک اٹھائے ہوئے، فرنیچر اٹھائے ہوئے، کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی بیوی کی پلنگ لے جاتے ہوئے............ اسے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نزدیک نہیں جائے گا اور وہ واپس مندر چلا گیا۔

سرپرست دیوتا کے مندر میں مزید اندھیرا تھا۔ جب اس نے بڑا گیٹ بند کیا تو اپنے کمرے تک راستہ ٹٹولتا گیا، اور کافی دیر لیٹے رہنے کے بعد کہیں جا کر وہ پرسکون ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اُس پر اس واقعے کے کیا اثرات ہوں گے۔ سفید ہیلمٹوں اور سفید زرہ بکتروں میں ملبوس لوگ یقیناً پہنچ چکے تھے، مگر وہ اسے بلانے نہ آئے تھے۔ وہ کئی چیزیں اٹھا لے گئے، مگر اُس کا حصہ نہ تھا............ یہ سب غیر ملکی شیطان کا قصور تھا، جس نے اسے انقلاب سے خارج کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ اپنا حصہ وصول کرنے میں کیونکر ناکام ہوتا۔ آہ کیو اس بارے میں جتنا زیادہ سوچتا جاتا اُتنا زیادہ اسے غصہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ انتہائی غضبناک ہو گیا۔ ''تو اس کا مطلب ہے میرے لیے کوئی بغاوت نہیں، صرف تمہارے لیے ہے، ہاں؟''۔ وہ حاسدانہ طور پر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جہنم میں جاؤ تم غیر ملکی شیطان............ ٹھیک ہے رہو باغی!۔ باغی کو سزا تو اس کا سر اڑا کر دی جاتی ہے............ میں اب جاسوس بن جاؤں گا تاکہ شہر میں تمہاری گردن اڑتی دیکھ سکوں............ تم اور تمہارا پورا خاندان............ قتل، قتل!''

باب نو

شاندار اختتامیہ

جب چاؤ خاندان کو لوٹا گیا تو وی چوآنگ میں سب لوگوں نے خوشی محسوس کی۔ مگر وہ خوفزدہ تھے، اور آہ کیو ان میں شامل تھا۔ مگر چار دن بعد آدھی رات کو آہ کیو کو اچانک شہر گھسیٹا گیا۔ یہ

سیاہ رات تھی جب سپاہیوں کا ایک سکواڈ، ملیشیا کا ایک سکواڈ، پولیس کا ایک سکواڈ اور خفیہ کے پانچ آدمی خاموشی کے ساتھ وی چوآنگ پہنچے اور اندھیرے میں سرپرست دیوتا کے مندر کا گھیراؤ کرلیا۔ انہوں نے گیٹ پر ایک مشین گن فٹ کردی۔ پھر بھی آہ کیو باہر نہ بھاگا۔ بہت دیر تک مندر میں خاموشی رہی۔ کپتان بے صبرا ہوگیا اور بیس ہزار نقد کا انعام رکھ دیا۔ تب ہی دو ملیشیا والوں نے دیوار پھلاندنے کی جرات کی اور اندر داخل ہوئے۔ پھر اندر سے تعاون کے بعد دوسرے بھی بھاگ کر اندر داخل ہوئے اور آہ کیو کو باہر گھسیٹا۔ مگر جب اسے مندر سے باہر لے جا کر ایک مشین گن کے پاس لے جایا گیا تو اس نے پرسکون ہونا شروع کیا۔

آدھی رات ڈھل چکی تھی جب وہ شہر پہنچے۔ آہ کیو نے خود کو ایلکھنڈر جیسے علاقے کی طرف لے جائے جاتے دیکھا جہاں پانچ چھ موڑ مڑنے کے بعد وہ ایک چھوٹے کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ جونہی وہ اندر لڑکھڑایا جنگلہ سا بناتا ہوا لکڑی کی سلاخوں کا دروازہ بند ہوگیا۔ کمرہ تین خالی دیواروں پر مشتمل تھا اور جب اس نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا تو اسے کونے میں دو اور آدمی نظر آئے۔

گو کہ آہ کیو بے آرام محسوس کر رہا تھا مگر وہ کسی صورت افسردہ نہ تھا اس لیے کہ وہ سرپرست دیوتا کے مندر کے جس کمرے میں سوتا تھا اس سے بالکل بھی اعلیٰ نہ تھا۔ وہ دونوں آدمی بھی دیہاتی لگ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس سے بات چیت کرنے شروع ہوئے اور ان میں سے ایک نے اسے بتایا کہ کامیاب صوبائی امیدوار اُس سے دادا کا لیا ہوا قرض لینے کے لیے سختیکرنا چاہتا ہے۔ دوسرے کو پتہ نہ تھا کہ وہ وہاں کیوں تھا۔ جب انہوں نے آہ کیو سے پوچھا تو اُس نے بلا تکلف جواب دیا،''اس لیے کہ میں بغاوت کرنا چاہتا تھا''۔

اُس سہ پہر وہ سلاخوں والے دروازے سے گھسیٹا گیا اور ایک بڑے ہال میں لایا گیا، جس کے دور کے سرے پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا جس کا سر صفائی سے ٹنڈ کیا ہوا تھا۔ آہ کیو نے پہلے اُسے بدھ مت کا بھکشو سمجھا، مگر جب اس نے نیچے کھڑے سپاہی اور دونوں اطراف لمبے کوٹوں میں ملبوس درجن بھر لوگ دیکھے، جن میں سے کچھ کے سر بوڑھے آدمی کی طرح ٹنڈ کیے ہوئے تھے اور

کچھ کے بال غیر ملکی شیطان کی طرح کندھوں تک لٹک رہے تھے، مگر سب اس کی طرف سخت چہروں پر غصیلی نظروں سے گھور رہے تھے، تب اسے معلوم ہوا کہ یہ آدمی کوئی اہم آدمی ہوگا۔ یک دم اس کے گھٹنوں کے گھٹنیڈ ڈھیلے ہوگئے اور نیچے جھک گیا۔

''کھڑے ہو جاؤ، اور بولو! مت جھکو!'' لمبے کوٹوں والے سارے لوگ چلاّئے۔ آہ کیو سمجھ تو گیا مگر وہ کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا۔ اس کا جسم غیر ارادی طور پر ایکدم جھکنے کی پوزیشن میں گر گیا اور وہ اس کو بہتر بنانے کی کوشش میں جھک گیا۔

''غلام............''۔ لمبے کوٹوں والے توہین آمیز انداز میں چیخے۔ البتہ انہوں نے اُس کے کھڑے ہو جانے پر اصرار نہ کیا۔

''سچ بولو تو تمہیں ایک نرم سزا ملے گی''۔ ٹنڈ سر والے بوڑھے نے آنکھیں آہ کیو پر جمائے ہوئے دھیمے مگر صاف آواز میں کہا۔'' میں ساری چیزیں پہلے سے جانتا ہوں۔ جب تم اعتراف کر لو تو میں تمہیں جانے دوں گا''۔

''اعتراف کرلو!'' لمبے کوٹوں والوں نے زور سے کہا۔

''سچ یہ ہے کہ میں نے چاہا............آجاؤں............'' آہ کیو ایک لمحہ کے کنفیوز غور کرنے کے بعد منمنایا۔

''تو پھر تم آئے کیوں نہیں؟''۔ بوڑھے نے آہستگی سے پوچھا۔

''غیر ملکی شیطان مجھے چھوڑتا نہ تھا!''۔

''بکواس۔ اب بات کرنے کو بہت دیر ہو چکی۔ تمہارے شریک جرم کہاں ہیں؟''۔

''کیا؟............''

''وہ جنہوں نے اُس رات چاؤ خاندان کے گھر میں ڈکیتی کی''۔

''وہ مجھے بلانے نہیں آئے انہوں نے وہ چیزیں خود کیں''۔ اس تذکرے نے آہ کیو کو غضبناک بنایا۔

''وہ کہاں گئے؟۔ اگر تم یہ مجھے بتا دو تو میں تمہیں جانے دوں گا''۔ بوڑھے نے مزید نرم

انداز میں کہا۔

''میں نہیں جانتا............وہ مجھے بلانے نہیں آئے............''۔

پھر، بوڑھے آدمی کے اشارے پر آہ کیو کو دوبارہ سلاخوں والے دروازے میں سے گھسیٹا گیا۔

اگلی بار جب اُسے باہر گھسیٹ کر لایا گیا تو وہ اگلی صبح تھی۔

اس بڑے ہال میں کوئی چیز تبدیل نہیں تھی۔ ٹنڈ سر والا بوڑھا ابھی تک وہاں بیٹھا ہوا تھا، اور آہ کیو پہلے کی طرح دوبارہ نیچے جھکا۔

''کیا تمہارے پاس اور کہنے کو کچھ ہے؟''۔ بوڑھے نے نرم لہجے میں پوچھا۔

آہ کیو نے سوچا، اور فیصلہ کیا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ اور نہیں ہے، اس لیے اس نے جواب دیا ''نہیں؟''۔

پھر لمبا کوٹ پہنے ایک شخص ایک کاغذ لایا، اور آہ کیو کے سامنے ایک برش لایا تاکہ یہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دے۔ آہ کیو اب اس سے خوفزدہ ہونے کے قریب تھا، اس لیے کہ یہ اس کی زندگی میں پہلی بار تھا کہ اُس کا ہاتھ لکھنے کے ایک برش سے رابطے میں آیا۔ وہ حیران تھا کہ ایک لکھنے والے برش کو کس طرح پکڑا جائے کہ اس شخص نے کاغذ پہ ایک جگہ پر اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس پر اپنا نام لکھو۔

''میں............ میں............لکھ نہیں سکتا''۔ آہ کیو نے ہاتھ میں قلم پکڑے ہوئے شرم سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کہا۔

''پھر، تمہاری آسانی کے لیے، ایک دائرہ بنا دو!''۔

آہ کیو نے دائرہ بنانے کی کوشش کی، مگر جس ہاتھ میں برش پکڑا تھا وہ کانپ گیا۔ چنانچہ اس شخص نے اُس کی خاطر کاغذ زمین پر بچھا دیا۔ آہ کیو نیچے جھکا اور، اتنی جانفشانی کے ساتھ کہ گویا اس کی زندگی کا انحصار اُس پہ ہو، ایک دائرہ بنالیا۔ اس خوف میں کہ لوگ اس پر ہنسیں گے، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دائرہ گول بنائے گا، مگر وہ ذلیل برش نہ صرف یہ کہ بہت بھاری تھا بلکہ ایک جگہ ٹھہر نہیں

رہا تھا، اِس پہلو سے اُس پہلو ڈگمگاتا جا رہا تھا۔ اور جونہی لائن بند ہونے کے قریب تھی یہ پھر ٹیڑھی ہو گئی۔ اور خربوزے کے بیج جیسی شکل بن گئی۔

جبکہ آہ کیو شرمندہ تھا اس لیے کہ وہ ایک گول دائرہ بنانے کے قابل نہ رہا تھا، وہ شخص پہلے ہی بغیر کسی تبصرہ کے کاغذ واپس لے چکا تھا۔ اور پھر بہت سے لوگوں نے اسے تیسری مرتبہ سلاخوں کے دروازے سے گھسیٹ لیا۔

اس بار وہ کوئی خاص جھنجھلایا نہیں۔ اس نے فرض کرلیا کہ اس دنیا میں ہر شخص کے مقدر میں تھا کہ کسی نہ کسی وقت اسے جیل کے اندر اور باہر گھسیٹا جائے، اور اسے کاغذ پر دائرے بنانے ہوں۔ یہ تو صرف اس لیے پریشان تھا کہ وہ دائرہ گول نہ ہوا تھا۔ البتہ اِس وقت یہ سوچتے ہوئے وہ دوبارہ ٹھیک ہو گیا ''جامع دائرے صرف احمق ہی بنا سکتے ہیں''۔ اور اس سوچ کے ساتھ وہ سو گیا۔

البتہ اُس رات کامیاب صوبائی امیدوار سو نہ سکا، اس لیے کہ وہ کپٹن سے جھگڑا تھا۔ کامیاب صوبائی امیدوار نے اصرار کیا تھا کہ سب سے اہم چیز چوری کا سامان برآمد کرنا تھا، جبکہ کپٹن نے کہا کہ سب سے اہم چیز عوام الناس کے لیے عبرت کی مثال قائم کرنا تھا۔ ابھی حال میں کپٹن نے کامیاب صوبائی امیدوار کے ساتھ بہت حقارت والا برتاؤ کرنا شروع کیا تھا۔ لہٰذا میز پر مکا مارتے ہوئے اس نے کہا ''ایک کو سزا دے کر سو کو خوفزدہ کرو۔ اب دیکھو نا۔ میں بیس دن سے بھی کم سے انقلابی پارٹی کا ممبر ہوں، مگر یہاں ڈاکہ کے درجن بھر واقعات ہوئے ہیں، ان میں سے ایک بھی حل نہ ہوا۔ سوچو مجھ پر اس کے کتنے برے اثرات پڑ رہے ہیں۔ اب جبکہ ایک واقعہ حل ہو گیا ہے تو تم ایک وکیل کی طرح دلیل دینے آئے ہو۔ تم چھوڑو۔ یہ میرا معاملہ ہے''۔

کامیاب صوبائی امیدوار بہت پریشان رہا، مگر ابھی تک اپنی بات پہ قائم تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اگر چوری کی ہوئی چیزیں برآمد نہ ہوئیں تو وہ فوری طور پر اسسٹنٹ سول ایڈمنسٹریٹر کے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے گا۔

''جیسے آپ کی مرضی'' کیپٹن نے کہا۔

نتیجے میں کامیاب صوبائی امیدوار اُس رات نہیں سویا۔ مگر مسرت سے اس نے اگلے دن

بہرحال استعفیٰ نہ دیا۔

تیسری بار آہ کیو کو جب دروازے سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا تو وہ اُس رات کے بعد کی صبح تھی جس میں کامیاب صوبائی امیدوار سو نہ سکا تھا۔ جب وہ بڑے ہال پہنچا تو سر منڈایا ہوا بوڑھا ابھی تک حسبِ معمول وہاں بیٹھا ہوا تھا، اور آہ کیو بھی حسبِ معمول جھکا۔

بہت آہستگی سے بوڑھے نے اس سے پوچھا'' کیا تم نے کچھ اور کہنا ہے؟''۔

آہ کیو نے سوچا، اور فیصلہ کیا کہ کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ اُس نے جواب دیا'' کچھ نہیں''۔

لمبے کوٹوں اور چھوٹے جیکٹوں میں ملبوس کئی لوگوں نے اُس پر غیر ملکی کپڑے کی ایک سفید چادر اوڑھادی جس پر کچھ سیاہ الفاظ لکھے تھے۔ آہ کیو نے کافی لاتعلقی محسوس کی، اس لیے کہ یہ ماتمی لباس سے کافی مشابہ تھا اور ماتمی لباس پہننا بد قسمتی تھی۔ بہ یک وقت اس کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے، اور اس حاکم کے دفتر سے باہر گھسیٹا گیا۔

آہ کیو کو ایک کھلے چھکڑے پر سوار کیا گیا، اور کئی لوگ اس کے ساتھ بٹھا دیے گئے۔ چھکڑا یکدم روانہ ہوا۔ آگے غیر ملکی بندوقیں لیے کئی سپاہی تھے اور چھکڑے کے دونوں طرف تماشبینوں کا ہجوم تھا۔ پیچھے کیا تھا یہ آہ کیو نہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر اچانک اسے لگا'' کیا میرا سر قلم کیا جانے والا ہے؟''۔

اُس پہ دہشت طاری ہوگئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس کے کان بجنے لگے جیسے کہ وہ بے ہوش ہوا ہو، مگر وہ اصل میں بے ہوش نہ ہوا۔ گو کہ وہ کچھ لمحے خوفزدہ رہا، مگر بقیہ وقت وہ پرسکون رہا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس دنیا میں شاید ہر شخص کی تقدیر ہے کہ کسی وقت اس کا سر قلم کیا جائے۔

اس نے سڑک پہچان لی اور حیران ہوا کہ وہ کیوں پھانسی گھاٹ کی طرف نہیں جا رہے ہیں؟۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اسے عوامی عبرت کے لیے گلیوں میں سے گھمایا جا رہا تھا۔ مگر اسے معلوم ہوتا بھی تو بات ایک ہی تھی۔ وہ پھر بھی یہی خیال کر لیتا کہ ہر شخص کی تقدیر ہی یہ ہے کہ اسے عبرت کا نشان بنایا جائے۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ سزائے موت کے میدان میں ایک جگہ بنا رہے ہیں۔ اس

لیے اسے بہرحال سر قلم کیے جانے کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ اس نے پشیمانی سے اپنے پیچھے پیچھے چیونٹیوں کی طرح جھنڈ کرتے لوگوں کی طرف دیکھا، اور غیر متوقع طور پر لوگوں کے اس بھیڑ میں سڑک پر اُسے آ ماہ وو نظر آئی۔ اچھا تو یہ وجہ ہے کہ وہ اسے اتنے عرصے تک نظر نہ آئی: وہ شہر میں ملازمت کرتی تھی۔

آہ کیو کو اچانک اپنی روح کی کمی پر شرمندہ ہوا اس لیے کہ اس نے کسی کوئی بھی شعر نہیں گایا تھا۔ اس کی سوچیں ایک بگولے کی طرح چکرائیں: جوان بیوہ اپنے خاوند کی قبر پہ'' کافی بہادرانہ نہ تھا'' ڈریگن اور شیر کی لڑائی'' والے الفاظ'' میں قتل کرنے پہ پشیمان '' بہت کمزور اشعار تھے۔'' میں تمہیں ایک فولادی عصا سے کچل دوں گا'' اب تک بہترین تھا۔ مگر جب اس نے اپنے ہاتھ بلند کرنے چاہے، تو اسے یاد آیا کہ وہ تو بندھے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس نے'' میں تمہیں کچل دوں گا'' بھی نہیں گایا۔

'' بیس سالوں میں میں ایک اور توانا نوجوان بن کے آجاؤں گا...........''۔ ہیجانی میں آہ کیو ایک ضرب المثل کا آدھا حصہ بولا جو اس نے پہلے کبھی استعمال نہ کیا تھا۔'' بیس برسوں میں میں ایک اور توانا نوجوان ہوں گا'' پھانسی چڑھنے سے قبل جرائم پیشہ لوگوں کی طرف سے استعمال کیا جانے والا فقرہ تھا، یہ دکھانے کہ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ روح کے منتقل ہوتے رہنے کا عقیدہ رکھتے ہوئے وہ سوچتے تھے کہ مرنے کے بعد اُن کی روح دوسرے زندہ جسموں میں داخل ہوگی۔ مجمعے کا شور'' اچھا!!!'' ایک بھیڑیے کے دھاڑنے جیسا لگ رہا تھا۔

ریڑھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ نعرے لگاتے ہوئے آہ کیو کی آنکھیں آ ماہ وو کی تلاش میں پھریں، مگر لگتا تھا جیسے وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی اس لیے کہ وہ سپاہیوں کی اٹھائی غیر ملکی بندوقیں دیکھنے میں مگن تھی۔

اس لیے آہ کیو نے اُس چیختے چلاتے مجمعے پہ ایک اور نگاہ ڈالی۔

اس لمحے اس کے خیالات دوبارہ ایک بگولے کی طرح گھومے۔ چار سال قبل پہاڑ کے دامن میں اس کا سامنا ایک بھوکے بھیڑیے سے ہوا تھا۔ جو ایک معین فاصلے سے اس کا تعاقب کرتا

رہا تھا۔ وہ آہ کیو کو کھانا چاہتا تھا۔ وہ خوف سے سمجھو مر چلا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی جس نے اسے وی چوآنگ واپسی کی جرات بخشی۔ مگر اُسے بھیڑیا کی وہ آنکھیں کبھی نہ بھولیں، وہشتناک مگر بزدل آنکھیں۔ وہ چمک رہی تھیں۔ جیسے وہ فاصلے سے اس میں سے سوراخ کر رہی ہوں۔ مگر اب وہ اس بھیڑیا سے بھی زیادہ خوفناک آنکھیں دیکھ رہا تھا، بے نور مگر پھر بھی گھستی ہوئی آنکھیں جنہوں نے لگتا تھا اس کے الفاظ ہڑپ کیے ہوں اور اس کے آگے گوشت اور خون سے بھی آگے کچھ کو ہڑپ کرنے کو تیار۔ اور یہ آنکھیں ایک معین فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

یہ آنکھیں لگتا تھا ضم ہو کر ایک بن گئی ہیں، اُس کی روح تک میں کاٹتی ہوئی آنکھیں۔

''مدد، مدد''

مگر آہ کیو نے یہ لفظ کبھی نہ کہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ سیاہ ہو چکا تھا، اس کے کانوں میں ایک بھنبھناہٹ تھی، اور اس نے محسوس کیا جیسے اس کا سارا بدن گرد و غبار کی طرح بکھیر دیا جا رہا ہے۔

جہاں تک ڈاکے کے بعد کے اثرات کے تعلق ہے، سب سے زیادہ متاثر کامیاب صوبائی امیدوار تھا۔ اس لیے کہ چوری شدہ سامان کبھی برآمد نہ ہوا۔ اس کا سارا خاندان تلخی کے ساتھ ماتم کرتا رہا۔ پھر چاؤ خاندان آتا ہے، اس لیے کہ جب کامیاب کاؤنٹی امیدوار ڈاکہ کی رپورٹ درج کرانے شہر گیا تو نہ صرف برے انقلابیوں نے اس کی چٹیا کاٹ دی تھی بلکہ اسے سودابازی میں بیس ہزار نقد انعام دینا پڑا، اس لیے چاؤ خاندان بھی پورے کا پورا تلخ ماتم کرنے لگا۔ اُس دن کے بعد وہ ایک زوال یافتہ شاہی خاندان کے پس ماندگان بن کر رہ گئے۔

جہاں تک اس واقعے کے کسی بحث کا تعلق ہے، وی چوانگ میں کوئی سوال نہ اٹھایا گیا۔ قدرتی طور پر سب اس بات پہ متفق تھے کہ آہ کیو ایک برا آدمی ہو گزرا ہے، ثبوت یہ ہے کہ اُسے گولی ماردی گئی۔ کیونکہ اگر برا آدمی نہ ہوتا تو اُسے گولی کیسے ماردی جاتی۔ مگر قصبے میں رائے کا اتفاق حق میں نہ تھا۔ اکثریت میں لوگ غیر مطمئن تھے، اس لیے کہ گولی اس قدر عمدہ نمائش نہیں جتنا کہ سر کاقلم

کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ کس قدر مضحکہ خیز خطا کار تھا، کہ اتنی زیادہ گلیوں سے ایک مصرع بھی گائے بغیر گزرا۔ انہوں نے بےکار اُس کے تعاقب کیے رکھا تھا۔

دسمبر 1921